□ پروفیسر سید جعفر رضا

تصوف: احیائے دین کی روحانی تحریک
(سریال۔۲)

تذکرۂ عارفین

صوفیہ کے روحانی سلاسل ومسالک کا ذکر گذشتہ صفحات (سریال۔ ۱) میں کیا جا چکا۔ صوفیہ کے مطابق نظام عالم کی ایک مخصوص اساس ہے۔ طبقات رجال الغیب یعنی دنیا اس لیے قائم وباقی ہے کہ اولیاء اللہ کے ایک مستور ومنظم روحانی سلسلہ کی شفاعت کی بدولت تمام آفات ارضی وسماوی ٹلتی رہتی ہیں۔ اگر یہ سلسلۂ شفاعت نہ ہو تو دنیا فنا ہو جائے۔ ولی کا تقرر منصوص من الولی ہوتا ہے۔ ایک ولی اپنی جگہ پر دوسرے ولی کو مقرر کرتا ہے۔ ایک ولی کی وفات پر دوسرا ولی اس کی جگہ لیتا ہے۔ اس میں کسی شوریٰ یا اجماع کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر زمانہ کے لیے اولیاء کی تعداد مقررہ ہے۔[۲] خواجہ سید علی ہجویری رقم طراز ہیں کہ حل و عقد مالک اور خدا کی بارگاہ کے سچے سپاہی تین سو کی تعداد میں ہیں جنھیں 'اخیار' کہتے ہیں اور چالیس دوسرے ہیں جنھیں 'ابدال' کہتے ہیں اور سات نور ہیں جنھیں 'ابرار' کہتے ہیں اور چار دیگر ہیں جنھیں 'اوتاد' کہتے ہیں اور تین دیگر ہیں جنھیں 'نقباء' کہتے ہیں۔[۳] اس مستور ومنظم عالمی نظام کی تفصیل صوفی نساب و مورخ شجاع الملک کی زبانی سنیے: "مراتب اولیائے دین کے چار ہیں—— صغریٰ و کبریٰ و وسطیٰ و عظمیٰ اور ہر ایک کے واسطے ان میں سے ایک ابتدا اور ایک درمیان اور ایک انتہائی اور گروہ اولیاء کے ان مرتبوں میں مقام رکھتے ہیں۔ کسی وقت عالم میں تین سو چھپن تن سے کم نہیں ہوتے اور ہمیشہ عاجزوں کی کارسازی اور گنہگاروں کی شفاعت میں مشغول ہیں اور اہل تصوف کے بزرگ اس جماعت سے تین سو تن کو ابطال جانتے ہیں اور چالیس نفر کو ابدال کہتے اور سات نفر کو سیاح بولتے ہیں اور پانچ نفر کو اوتاد سمجھتے ہیں اور تین نفر کو قطب الاوتاد جانتے ہیں اور ایک نفر کو قطب الاقطاب تصور کرتے ہیں۔ پس جس وقت کہ ایک ان میں سے فوت ہووے، مرتبہ ماوون اس کی ایک بجائے اس کے لاتے ہیں۔ مثلاً اگر قطب الاقطاب مر جاوے، ایک قطب ثلثہ یعنی تینوں قطب سے بجائے اس کے مقام کریں اور اوتاد سے ایک کو ثلثہ اور ایک سیاح کو بجائے اوتاد اور تمام تین سو چھپن تن سے نو تن ارشاد کے لائق ہیں اور باقی بھی اگرچہ کسی مرتبہ میں مراتب ولایت سے مقام

رکھتے ہیں لیکن ارشاد کے سزاوار نہیں اور ان نو تن میں پانچ تن اوتاد ہیں اور تین اقطاب اور ایک قطب الاقطاب۔ ۴ قطب الاقطاب ہی وہ مرکز ہے، جس کے گرد سارا نظام کائنات گردش کرتا ہے۔ یہی سلسلہ شفاعت ہے جس سے روحانی سلاسل بنتے ہیں۔

مذکورہ بالا مستور و منظم عالمی نظام کے مطالعہ میں اسلامی تکوینی تفہیم کی اساس پر نظر رکھنا ناگزیر ہے کہ جس طرح ساری مخلوقات خواہ بہ رضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ بہر صورت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے، اسی طرح اسلام بھی قانون قدرت کی جبری و پیروی کا پابند ہے۔ ہر شے حکم اللہ تعالیٰ کی پابند ہے۔ یہ اختیار کسی نبیؑ، پیغمبر کو حاصل نہیں ہے۔ البتہ کسی خاص ضرورت کے پیش نظر معجزہ کے طور پر کسی محدود مدت کے لیے اللہ تعالیٰ یہ اختیار کسی نبیؑ، پیغمبر کو تفویض کر سکتا ہے اور تفویض کیا بھی لیکن کسی نبیؑ، پیغمبر کو یہ اختیار کلیۃً حاصل نہیں ہے۔ قرآن الحکیم تاکید کرتا ہے: الله يحكم لامعقب لحكمه (اللہ ہی حکم دیتا ہے۔ الرعد ۱۳/ ۴۱) الا له الخلق والامر (سب اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ الاعراف ۷/ ۱۱۷) افغير دين الله يبغون وله اسلم من فى اسمٰو اتوالارض طوعاً واليه يرجعون (کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے علاوہ کچھ اور تلاش کر رہے ہیں جبکہ زمین و آسمان کی ساری مخلوقات بہ رضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ اس کی بارگاہ مین سر تسلیم خم کیے ہوے ہیں۔ آل عمران ۳/ ۸۳) صوفیہ کا عقیدہ کہ اقطاب کی بدولت دنیا قائم ہے۔ اقطاب کی بدولت تمام آفات ارضی و سماوی ٹلتی رہتی ہے، وہ منزل ہے کہ امام کیا، پیغمبر بھی فائز نہیں ہیں!

مستور و منظم عالمی نظام کا اہم پہلو ہے کہ صوفیہ ان روحانی سلاسل و مسالک کے شجرہ روحانی کی تلاش و تحقیق میں قرآن الحکیم کی رہنمائی کی جائے تو اس آیت مبارکہ سے روشنی ملتی ہے: الله نور السنوات و الارض مثل نوره كمشكوٰة فيها مصباح المصباح فى زجاجة الزجاجة كا نها كوكب درى يو قد من الشجره مبٰرلة زيتونة لاشرقية ولاغربية يكاد زيتها يضى ء ولولم تمسسه نار نور علىٰ نور يهدىٰ الله النوره من يشاء ويضرب الله الامثل للناس و الله بكل شىءٍ عليم (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال اس طاق کی ہے، جس میں چراغ شیشہ کی قندیل میں ہو اور قندیل ایک جگمگاتے ستارے کے مانند ہو، جو زیتوں کے بابرکت شجر سے روشن کیا جائے جو نہ مشرقی ہو، نہ مغربی ہو اور قریب ہے کہ اس کا روغن بھڑک اُٹھے اسے آگ کمس بھی نہ کرے۔ یہ نور بالائے نور ہے اور اللہ اپنے نور کے لیے جسے چاہتا ہے، ہدایت دیدیتا ہے اور اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔ النور ۲۴/ ۳۵)۔ مولانا حافظ سید فرمان علی مرحوم نے خواجہ حسن بصری اور شیخ ابوالحسن نازلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مشکوٰۃ سے مراد حضرت فاطمہ زہرا، مصباح سے حضرات حسنینؑ اور شجرہ مبارکہ سے حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ شرقی و غربی نہ ہونے سے ان کا یہودی و نصری نہ ہونا یکاد زیتها سے کثرت علم اور نور علىٰ نور سے ایک امام بعد دوسرے امام کے معبوث ہونے کا حوالہ ہے اور يهدىٰ الله النوره سے محبت و مودت اہل بیت اطہار مراد ہے۔ ۵

مذکورہ بالا آیات کریمہ کی روشنی میں صوفیہ کے شجرۂ روحانی سے متعلق مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں، خاص طور پر سلسلۃ الذھب کے صوفیہ کے شجرۂ روحانی سے متعلق مسائل، جو اپنا شجرۂ روحانی سرکارِ ختمی مرتبتؐ کے بعد حضرت علی سے براہ راست قائم کرتے ہیں، اور دوازدہ ائمہ اہل بیت کو اکابر اولیاء اللہ میں شمار کرتے ہیں۔ سلسلۃ الذھب کو قرآنی اصطلاح میں زیتوں کے بابرکت شجر کی معنویت سے وابستہ کر کے دیکھا جائے تو حقائق کو صحیح تناظر میں دیکھنے کی توفیق حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی نورانی سلسلہ میں اتحاد بین المسلمین کی اساس موجود ہے، جس سے مختلف اسلامی فرقے دوبارہ اتحاد و اتفاق کے رشتوں میں منسلک ہو سکتے ہیں، اپنے گوناگوں مسائل کی پیچیدگیوں کو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر حل کر سکتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر بنی نوع انسان کی رہبری و رہنمائی میں اپنا تاریخی کردار پیش کر سکتے ہیں جس کی توقع و مطالبہ قرآن الحکیم ان سے کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے صدرِ اوّل کے متعلق ماہرین تصوف نے وضاحت کر دی ہے کہ اس وقت متقین کی جماعت (جماعت صوفیہ) اسلام کے دینی اقدار کی حفاظت کے لیے ہر حضرت علی کی رہنمائی میں ان کے گرد و پیش جمع ہو گئی تھی، وہی ابتدائی شیعیت بھی تھی اور ابتدائی تصوف بھی۔ اس تحریک احیائے دین کو اسلامی تاریخ کے اولین دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وقت کی پکار ہے، ملی و قومی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر بھی۔

صوفیہ کے تمام روحانی سلاسل سرکارِ ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شروع ہوتے ہیں پھر حضرت علی ابن ابی طالب سے جو روحانی شجرۂ مبارکہ کی اساس ہیں۔ اہل تشیع درود پڑھتے ہیں: اللھم صلی علی محمد و آل محمد (خدایا، رحمت کر محمدؐ اور ان کی اولاد پر)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سرکارِ ختمی مرتبت کے جد امجد ہیں۔ اہل تسنن مفصل درود پڑھتے ہیں، جس میں سرکارِ ختمی مرتبت، ان کی اولاد کے علاوہ ان کے جد اور ان کی اولاد پر بھی درود پڑھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سرکارِ ختمی مرتبت، ان کی اولاد پر دوبارہ درود پڑھتے ہیں۔: اللھم صلی علی سیدنا و مولا محمد و آل محمد کماصلیت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم انک حمیدٌ مجید اللھم صلی علی سیدنا و مولانا محمد و آل محمد کما بارکت علی ابراہیم انک حمیدٌ مجید۔ (خدایا، رحمت کر ہمارے سردار اور مولا محمدؐ اور ان کی اولاد پر جس طرح تو نے رحمت کی ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر اور خدایا، برکت کر ہمارے سردار اور مولا محمدؐ اور ان کی اولاد پر جس طرح تو نے رحمت کی ابراہیمؑ اور ان کی اولاد پر۔ یقیناً تو بہترین صفات کا حامل اور بزرگ ہے۔) اس طرح اہل تشیع اور اہل تسنن کے درود کی روح و منشاء ایک ہے یعنی سرکارِ ختمی مرتبتؐ، ان کی اولاد پر درود پڑھنا۔ اہل تشیع اور اہل تسنن دونوں میں درود جزو نماز ہے۔ روزانہ کم از کم سترہ بار پڑھنا لازمی ہے۔ اس میں صوفیہ کا تمام سلاسل بھی شامل ہیں۔ کسی مخصوص سلسلہ کی بات نہیں۔ روزانہ کم از کم سترہ بار دھرانے تاکید و تجدید عمل ثابت ہے۔ درود شریف میں جس روحانی شجرہ کی نشان دہی کی گئی ہے، وہ سرکارِ ختمی مرتبت کے بعد ان کی اولاد پر مشتمل ہے۔ قرآن الحکیم میں اولاد رسول کی صراحت کر دی گئی ہے: انا اعطینک الکوثر (بیشک ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا ہے۔ الکوثر ۱۰۸/۱) اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ کفار عرب سرکارِ ختمی مرتبتؐ کے بیٹا

نہ ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے، جواب میں آیت نے بتادیا کہ حسینؓ رسول کے فرزند ہیں، جن کی اولاد میں کثرت ہوگی۔[6]

سلسلۃ الذھب کو خصوصیت حاصل ہے کہ ان سلاسل میں رشد و ہدایت کے لیے فرزندان رسول کی تائید اور درود شریف کی پیروی حاصل ہو جاتی ہے۔ حدیث رسول سے مزید روشنی ملتی ہے: قال رسول اللّٰہ لکل نبي وصی ووارث و ان علیاً وصی ووا رثی (رسول اللہ نے فرمایا کہ ہر پیغمبر کا ایک وصی اور وارث ہوتا ہے اور علیؓ میرا وصی اور وارث ہے۔[7] سلسلۃ الذھب میں سرکارِ ختمی مرتبتؐ کے بعد حضرت علی کو پیرومرشد مانتے ہیں، جن کو عقیدۂ صوفیہ کے مطابق سرکارِ ختمی مرتبتؐ نے اپنا خرقہ روحانی خلافت راشدہ کے اولین تینوں خلفاے عظام کی استدعاؤں کو رد کرتے ہوئے مرحمت کیا تھا۔[8] اس سلسلہ میں امام حسنؓ و امام حسینؓ کے علاوہ خواجہ حسن بصری، خواجہ کمیل ابن زیاد اور حضرت اویس قرنی اہم ہیں۔ امام جعفر صادقؒ سے سلسلہ طیفوریہ قائم ہوتا ہے۔ خواجہ معروف کرخی امام رضاؑ کے ملازمین میں تھے، جن سے سلسلہ جنیدیہ شروع ہوا۔ اسی میں شیخ عبدالقادر جیلانی کا سلسلہ قادریہ بھی شامل ہے۔ اس کو ام السلاسل بھی کہتے ہیں کیونکہ اس سلسلہ سے دیگر سلاسل بھی کسی نہ کسی منزل پر وابستہ ہوتے رہتے ہیں۔ خواجہ معروف کرخی کا سلسلہ خواجہ حسن بصری سے بھی ہے۔ ان میں جنیدیہ بھی شامل ہیں اور سلسلہ چشتیہ بھی قائم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے اولین صوفی سید علی عثمان ہجویری داتا گنج بخش بھی اس سلسلہ میں شامل ہیں۔ چشتیہ کو حضرت کمیل ابن زیاد سے بھی نسبت ہے۔ ان سے سلسلہ خواجگان بھی اپنا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ خواجہ کمیل کے سلاسل میں ادھمیہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ حضرت اویس قرنی سے صوفیہ کا تمام سلاسل اپنی اپنی گم شدہ کڑیاں ملا دیتے ہیں، جس کی بنا پر سلسلۂ اویسیہ تقریباً تمام سلاسل میں ملتا ہے۔ طیفوریہ کو طریقت صدیقیہ بھی شامل کیا جاتا ہے۔ طیفوریہ سے متعدد سلاسل وجود میں آئے، جن میں خضریہ، رفاعیہ، قلندریہ، مداریہ، حامیہ وغیرہ کے علاوہ مشقیہ بہر جو جنیدیہ سے قادریہ بھی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ سلسلہ جنیدیہ وسیع ترین سلسلہ ہے، جس میں قادریہ، چشتیہ، نعمت اللّٰہیہ، منعمیہ، مغربیہ، وسیر اوینہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان سلاسل سے انگنت سلسلے شروع ہوئے، جن کو شمار کرنا دشوار ہے۔ لیکن برصغیر ہند و پاک چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ کو زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ قلندریہ کو انفرادیت حاصل ہے اور مقبولیت میں دیگر سلاسل سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

طریقت صدیقیہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر سے معنون ہے۔ یہ سلسلہ تین طرح سے شروع ہوتا ہے اولاً سرکار دو عالم کے بعد حضرت ابوبکر اور ثانیاً سرکارِ ختمی مرتبتؐ کے بعد حضرت سلمان فارسی اور ان سے حضرت ابوبکر۔ طریقت صدیقیہ کی دوسری شاخ امام علی الرضا کے وسیلے سے حضرت علی تک پہنچتی ہے اور سلسلۃ الذھب میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس طرح سلسلۃ الذھب کو طریقت صدیقیہ سے منسلک ہو جاتا ہے۔ اس سلسلۂ طریقت کی اساس نسبی ہے کہ امام محمد باقر کی زوجہ حضرت جوریہ، حضرت ابوبکر کے بیٹے حضرت محمد کی پوتی اور دوسرے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن کی نواسی تھیں جن سے امام جعفر صادق کی ولادت ہوئی۔ اسی رشتہ کی بنا پر امام جعفر صادقؒ کا قول مشہور ہے کہ میں دو بار حضرت ابوبکرؓ سے پیدا ہوا ہوں۔ امام

جعفر صادق کا لقب صادق ان کے پرنانا حضرت ابوبکر کے لقب صدیق سے ہم معنی ہے۔امام محمد باقراورامام جعفر صادق کی اہل تسنن اوران میں خاص کر مسلک حنفی میں اساسی اہمیت ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ ان کے شاگرد تھے اوراس پر تفاخر کرتے تھے۔اپنی عمر کے فقط ڈھائی سال امام جعفر صادق کی خدمت میں گذارے تھے۔اس کے علاوہ اپنی باقی عمر کوعمر رائگاں قرار دیتے تھے۔طریقت صدیقیہ میں امام محمد باقر اورامام جعفر صادق کواولیائے کبار میں شامل کیا جاتا ہے،جن سے رشدوہدایت حاصل کرکے خرقہ وبیعت کی روایت آگے بڑھی۔طریقت صدیقیہ میں شیخ عبداللہ علمبردار اور خواجہ عباس الخضر کے سلسلہ کے علاوہ سلسلۂ خواجگان اہم ترین ہے۔سلسلہ خواجگان سے سلسلہ نقش بندی اور پھراس سے ابوالعلائیہ شروع ہوا۔میں نقش بندیہ اور ابوالعلائیہ کوزیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ڈاکٹر سعید نفیسی نے سلسلۂ نقش بندیہ کے بانی خواجہ بہاء الدین نقش بند کے رسالہ قدسیہ کے حوالے سے انھیں کا قول نقل کیا ہے کہ سلسلۂ خواجگان سلسلۂ ملامتیہ سے ماخوذ ہے۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ''مشائخ طریق نقش بندی کہ پیروان طریقۂ خواجگان بودہ۔اندخودرااز ملامتیان می دانستہ اندو پیش روان ایشیان کہ مشائخ طریقۂ خواجگان باشند نیز ہمیں عقیدہ راداشتہ اندواز بیان آن بہ صراحت تمام خودداری نکردہ اند وناچار برخی ازوجوہ اشتراکی کہ درمیان ملامتیان ازصوفیہ وجوان مردان وفتیان بودہ درین طریقہ نیز بودہ است۔''۹ یعنی سلسلۂ نقش بندیہ کے مشائخ طریقت خواجگان کے پیرو تھے۔خودکو ملامتیوں میں شامل کرتے تھے اوران کے پیش رواں میں مشائخ اس کا خیال رکھتے جس کا کھل کر اظہار کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ان صوفیوں،جواں مردوں،فیتوں اور ملامتیوں کی مشترک چیزیں لازمی طور پر نقش بندیوں میں بھی موجود تھیں۔

اہل تشیع کے متعلق عام خیال ہے کہ تصوف سے ان کا تعلق تیسری صدی ہجری(نویں صدی عیسوی) سے ختم ہو چکا ہے جو غیر صحیح ہے۔اس مسئلہ پر اپنی جگہ تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے،البتہ اتنا عرض کردینا ضروری ہے کہ اہل تشیع میں تصوف کسی دور میں کلیتہً ترک نہیں ہوا،مگر اس مقبولیت میں ضرور کمی آئی۔برصغیر کی ان خانقاہوں کے علاوہ جو بعد کے ادوار میں ترک مسلک کرکے شیعہ ہو گئیں،اہل تشیع میں سلسلۂ خرقہ وبیعت زیادہ تر باقی نہیں رہا،حالانکہ خانقاہ اوچہ کے صوفیہ کا دعوٰی ہے کہ خواجہ جہانیاں جہاں گشت اوران کے اجداد کا شیعہ ہونا کئی مصادر میں درج ہے۔مثلاً ریاض الانساب کے بیان کا خلاصہ یہ ہے: "سید جلال ماضی (سید جلال سرخ پوش) عراق سے بخارا تشریف لے گئے۔وہاں مروانیوں نے آپ کو بہت ستایا تو وہاں سے کابل (افغانستان) آگئے،وہاں بھی سکون نہ ہوا تو ہندوستان چلے آئے۔چونکہ یہاں کے باشندے عقائدِ حنفیہ کے پیرو تھے اوراہل بخارا بھی اسی عقیدہ کے متبع تھے،اس لیے تقیہ کو ترجیح دی اور سلاطین ہند نے آپ کی بڑی تعظیم و تکریم ملحوظ رکھی۔اور ان کی اولاد ہندوستان کے اہل تسنن کی صحبت کی وجہ سے اپنا مذہب اور عقیدہ تقیہ کھو بیٹھی۔"۱۰ ماثر الامراء میں خواجہ جہانیاں جہاں گشت کے متعلق درج ہے: "گویند مذہب سید وآبائے ایشاں امامیہ است"۱۱ لیکن خواجہ جہانیاں جہاں گشت کی اپنی تصانیف سے ان کا شیعہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ممکن ہے کہ تقیہ کرنے کی بنا پر ان کی تصانیف تقیہ کا مظہر ہو گئی ہوں۔امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کا سلسلہ طریقت کشمیر

میں مقبول ہے، لیکن اہل تسنن میں ہے۔ان کو عام طور پر شافعی العقیدہ قرار دیا جاتا ہے لیکن اگر ان کی مشہور و معروف کتاب مودة القربیٰ ان کا شیعی ہونا ثابت کرتی ہے، جس میں انھوں نے متعدد ایسی احادیث رسول درج کی ہیں، جن میں تنہا شیعان علی کو ناجی قرار دیا گیا ہے۔۱۲ نوربخشیہ کے شیعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ کے متعلق کنزالانساب میں درج ہے:۹ اس مذہب کے لوگ حضرت مولا علی علیہ السلام کو مظہر ذات خدا تصور کرتے ہیں لیکن پیروائمہ اثناعشری کے ہیں، شیعہ نوربخشیہ اثناعشریہ صوفیہ کہلاتے ہیں۔" ۲۴ ترکی میں سلسلہ طریقت بکتاشی باقی ہے اور ان کی خانقاہیں آباد ہیں۔ان صوفیوں کو عثمانی حکمرانوں کے دور میں خصوصی مقبولیت حاصل ہوئی۔سلسلۂ بکتاشی کے موسس حاجی بکتاش تھے۔ ان کو سب نے شیعی صوفیہ مانا ہے لیکن پروفیسر کبیر احمد جائسی سلسلۂ بکتاشی کو شیعہ نہیں مانتے، موصوف لکھتے ہیں: 'اس سلسلہ سے منسلک افراد قدرے آزاد خیال ہونے کے ساتھ ساتھ خلافت کے بجائے امامت کے قائل ہیں لیکن اس کے باوجود شیعہ نہیں ہیں۔اس سلسلے کے افراد کا دینی مسلک شیعوں اور سنیوں کے دینی مسلکوں کے بین بین ہے۔' ۱۳ لیکن مشہور ماہر بکتاشیات برج نے سلسلۂ بکتاشی کو شیعی صوفیہ میں شمار کیا ہے۔ ۱۴ اس سے موجن مومن نے بھی اتفاق کیا ہے۔۱۵ ایران میں شیعی صوفیہ کے چند سلاسل ہنوز قائم ہیں۔مذکورہ بالا شیعی سلاسل کے علاوہ طریقت کوثر علی شاہی، طریقت گن آبادیہ، طریقت صفی علی شاہی، طریقت شمس العرفاء، طریقت ذوریاستین وغیرہ ہنوز قائم ہیں۔

صوفیہ کے دیگر سلاسل میں ایک مختصر سی جماعت رسول اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی الله علیه و آله و سلم کے بعد حضرت علی کی بجائے حضرت ابوبکر سے قائم کرتی ہے۔اس سلسلہ کے موسس حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر ہیں۔لیکن یہ روحانی سلسلہ بھی بعد میں امام جعفر صادق سے وابستہ ہوجاتا ہے گم شدہ سلاسل خواجہ اویس قرنی سیر زنۂ روحانی ائمہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں پہلی اہم ترین بات یہ ہے کہ زیادہ تر صوفیہ حضرت علی ابن ابی طالب سے روحانی سلسلہ قائم کرتے ہیں جس کے لیے 'چار پیر' کی اصطلاح رائج ہے۔'چار پیر' ہیں: امام حسن، امام حسین، خواجہ حسن بصری اور خواجہ کمیل بن زیاد۔صوفیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی ابن ابی طالب نے رسول اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی الله علیه و آله و سلم سے خرقۂ طریقت عطا ہونے کے بعد ستر افراد کو مریدی کا شرف بخشا اور 'چار پیر' یعنی امام حسن، امام حسین۔ خواجہ حسن بصری اور خواجہ کمیل بن زیاد کو خرقۂ خلافت سے سرفراز کیا۔عطاے خرقۂ طریقت معراج سے وابستہ ہے جو قبلِ ہجرت کا واقعہ ہے۔امام حسن، امام حسین دونوں بھائیوں کی ولادت بعد ہجرت مدینہ منورہ میں ہوئی، لہٰذا عطاے خرقۂ طریقت بعد کے ادوار میں ہی ممکن ہوسکتی ہے۔اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا چاہیے کہ خواجہ حسن بصری حضرت علی سے براہ راست بیعت نہیں تھے بلکہ صحابی رسول عمران بن حصین الخزاعی (م۔۵۳ھ/۶۷۲ء) کے واسطے سے مرید تھے۔۱ بلکہ ابن الجوزی اور ذہبی کا اعتراض کیا ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب اور خواجہ حسن بصری کی ایک دوسرے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ۵ خواجہ حسن بصری، امام حسن، امام حسین دونوں بھائیوں کے تربیت یافتہ تھے، اس لیے ان سے خرقۂ طریقت ممکن

ہے۔ خواجہ کمیل بن زیاد امام علی الرضا کے ملازم تھے۔ ان کے اور حضرت علی کے درمیان دو سو سال کا بُعد زمانی ہے۔ اس لیے قوی امکان ہے کہ انھیں امام علی الرضا سے خرقۂ طریقت عطا کیا ہو۔ امام علی الرضا سے وابستہ طریقت کو سلسلۃ الذہب کہا گیا۔ اس طرح خواجہ کمیل بن زیاد کو خرقۂ طریقت قبل کے دیگر تمام ائمہ اہل بیت میں منتقل ہونے کے بعد امام علی الرضا سے عطا ہوا۔ حضرت علی سے براہ راست خرقۂ طریقت عطا ہونا خارج از امکان ہے۔

دیگر مروجہ اصطلاح 'سات خانوادے' ہے۔ 'سات خانوادے' سے مراد سات سلاسل ہیں:

۱۔ سلسلۂ سلمانیہ: معنون بہ خواجہ سلمان فارسی
۲۔ سلسلۂ اویسیہ: معنون بہ خواجہ اویس قرنی
۳۔ سلسلۂ بصریہ: معنون بہ خواجہ حسن بصری
۴۔ سلسلۂ کمیلیہ: معنون بہ خواجہ کمیل بن زیاد
۵۔ سلسلۂ یمینیہ: معنون بہ خواجہ یمین الدین شامی
۶۔ سلسلۂ قلندریہ: معنون بہ خواجہ مدایونی قلندر (مدایوں مکہ معظمہ کا ایک محلہ ہے۔)
۷۔ سلسلۂ نقشبندیہ: معنون بہ خواجہ قاسم بن محمد بن ابوبکر

صوفیہ کی ایک اور مروجہ اصطلاح 'چودہ خانوادے' ہے۔ 'چودہ خانوادے' سے مراد چودہ سلاسل ہیں جو خواجہ حسن بصری کے سلسلۂ بصریہ سے جاری ہوئے۔ ان میں دو خلفائے طریقت کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی: خواجہ معروف کرخی اور خواجہ عبدالواحد بن زید۔ ان میں اولاً نو سلاسل خواجہ معروف کرخی سے اور باقی پانچ سلاسل خواجہ عبدالواحد بن زید سے جاری ہوئے:

۱۔ سلسلۂ کرخیہ: معنون بہ خواجہ معروف کرخی
۲۔ سلسلۂ جنیدیہ: معنون بہ خواجہ جنید بغدادی
۳۔ سلسلۂ طیفوریہ: معنون بہ خواجہ بایزید طیفور بسطامی
۴۔ سلسلۂ سقطیہ: معنون بہ خواجہ حسن سقطی
۵۔ سلسلۂ حبیبیہ: معنون بہ خواجہ حبیب عجمی
۶۔ سلسلۂ گازرونیہ: معنون بہ خواجہ ابواسحٰق گازرونی
۷۔ سلسلۂ طوسیہ: معنون بہ خواجہ ابوالفرح طرطوسی
۸۔ سلسلۂ کبرویہ: معنون بہ خواجہ نجم الدین ولی تراش
۹۔ سلسلۂ سہروردیہ: معنون بہ خواجہ شہاب الدین سہروردی زنجانی
۱۰۔ سلسلۂ زیدیہ: معنون بہ خواجہ عبدالواحد بن زید
۱۱۔ سلسلۂ عیاضیہ: معنون بہ خواجہ فضیل بن عیاض
۱۲۔ سلسلۂ ادہمیہ: معنون بہ خواجہ ابراہیم بن ادہم

۱۳۔ سلسلۂ ہبیر یہ: معنون بہ خواجہ ہبیرۃ البصری
۱۴۔ سلسلۂ چشتیہ: معنون بہ خواجہ ابو اسحٰق چشتی

سلسلۂ چشتیہ کو خواجہ معین الدین چشتی سجزی سے ایسی تقویت حاصل ہوئی کہ ان کے نام نامی کا متبادل ہوگیا۔ خانوادۂ چشتیہ میں چودہ سلاسل قائم ہوئے: چشتیہ، کرمانیہ، کریمیہ، نظامیہ، صابریہ، مخدومیہ، حسامیہ، قلندریہ، فخریہ، جلیلیہ، نظام شاہی، حمزہ شاہی، قلندر شاہی اور چاکھا شاہی۔ خانوادۂ طیفوریہ میں چھاسٹھ سلاسل قائم ہوئے جن میں طبقاطیہ اور شطاریہ زیادہ مشہور ہوئے۔ فقط طبقاطیہ کے ہینسٹھ سلاسل ہوئے جن میں سات عاشقان، چار خادمان، دو طالبان اور باون دیوانگان کہے گئے۔ خاوادۂ جنیدیہ کے سلاسل میں انصاریہ، رفیعہ اور بسویہ کو شہرت حاصل ہوئی۔ خواجہ ابراہیم بن ادہم کے سلسلۂ طریقت میں سلسلۂ خضریہ کو مقبولیت ملی۔ خانوادۂ سقطیہ میں نوریہ مشہور ہوئے۔ خانوادۂ گازرونیہ میں زاویہ اور اولیا مقبول ہوئے۔ خانوادۂ کبرویہ میں فردوسیہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی، خانوادۂ طوسیہ سے اکیس سلاسل جاری ہوئے: قادریہ، رزاقیہ، وہابیہ، قیشیہ، خلیلیہ، جیاریہ، قمیصیہ، جلیلیہ، حسین شاہی، محمد شاہی، نعمت اللہ شاہی، سید شاہی وغیرہ۔ خانوادۂ سہروردیہ سے سترہ سلاسل جاری ہوئے: جلالیہ لعل شہبازیہ، مخدومیہ، کرم علی جہلی او دموی شاہی جو سدا سہاگ مشہور ہیں، رسول شاہی، اسمٰعیل شاہی، عبدوسیہ، قاسم شاہی، رزاق شاہی، دولھا شاہی، سید شاہی، مرتضٰی شاہی، اناتہ شاہی وغیرہ۔ مزید تفصیل کی گنجائش نہیں۔[۱۶]

ہندوستان میں صوفیہ کے روحانی سلاسل کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ صوفیہ بیک وقت کئی روحانی سلاسل کے حامل ہوتے ہیں۔ صوفیہ کی روایت رہی ہے کہ بیک وقت کئی سلاسل سے بیعت میں رہتے ہیں۔ اہل فقہ اصرار کرتے ہیں کہ کوئی مسلمان بس ایک فقہ کا پابند ہو سکتا ہے۔ اگر حنفی ہے تو بس فقہ امام ابو حنیفہؒ کا پابند رہے گا، کسی مسئلہ میں دیگر فقہوں سے استنباط نہیں کر سکتا اور یہی صورت حال دیگر فقہوں کے لیے بھی ہے۔ لیکن صوفیہ بعض مباحث میں ایک سلسلہ کے پابند ہیں تو دوسرے مباحث میں کسی دوسرے سلسلے کے۔ اس لیے ان کو کسی ایک سلسلہ کی بجائے کئی کئی سلسلوں میں شمار کر لیا جاتا ہے۔ مزید براں اگر کوئی صوفی کسی بنا پر ممتاز ہو جاتا ہے تو اس کے نام سے نیا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ابوالفضل نے صوفیہ کے چودہ سلاسل کا ذکر کیا ہے جو اس وقت کے ہندوستان میں رائج تھے۔ ان چودہ سلاسل میں قادریہ ونقشبندیہ دو الگ الگ سلسلے نہیں ہیں۔ البتہ شہزادہ دارا شکوہ نے ان کی تعداد محض چھ قرار دی ہے— قادریہ، خواجگان، چشتیہ، کبرویہ، سہروردیہ اور متفرقہ۔ لیکن پروفیسر خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ ہندوستان میں صرف مندرجہ ذیل چھ سلاسل نے کارنامے انجام دئے اور وہ ہیں— چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، شطاریہ، نقش بندیہ اور فردوسیہ۔ ہمارے نزدیک یہ بیان درست نہیں ہو سکتا۔ سلسلہ فردوسیہ بھی سلسلہ ہمدانیہ کی طرح سلسلۂ کبرویہ کی شاخ ہے۔ اگر فردوسیہ کی بجائے وہ سلسلہ کبرویہ کہتے تو مضائقہ نہ تھا لیکن اگر فردوسیہ کا ذکر ہوگا تو ہمدانیہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح سلسلۂ جنیدیہ کے ذیل میں فقط سلسلہ قادریہ کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ شیخ ابوالخیر طاؤسی کا سلسلۂ طاؤسیہ، شیخ احمد کبیر رفائی کا سلسلۂ رفاعیہ اور شیخ ابوالفضل بن عبدالمنعم کا سلسلۂ منعمیہ

بھی ترک ہوگیا ہے۔ شیخ عبداللہ برکی کے سلسلہ کے بیان میں مداریہ اور قلندریہ کا ذکر بھی نہیں کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ سلسلہ اویسیہ کا ذکر بھی شامل نہیں ہے جس کی شمولیت کے بغیر صوفیہ کا کوئی روحانی سلسلہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ سلسلۂ اویسیہ کے شیخ ابو اسحٰق کازرونی کی خانقاہیں ہندوستان سے چین تک پھیلی ہوئی ہیں۔ حیرت ہے کہ پروفیسر موصوف کو کہیں نظر نہ آئیں! عصر حاضر میں ہندوستان میں صوفیہ کے چودہ سلاسل زیادہ مروج ہیں جن کے نام ہیں: چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ، شطاریہ، فردوسیہ، ہمدانیہ، مداریہ، نعمت الٰہیہ، قلندریہ، طادسیہ، رفاعیہ، منعمیہ اور اویسیہ۔ اوّل الذکر چاروں سلسلوں میں چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ کے کئی کئی ضمنی سلسلے ہیں، جن کی اپنی اپنی انفرادیت ہے۔

صوفیہ کی قدیم ترین اسناد کی حیثیت سے خلدی (م۔ ۳۴۸ھ/۹۵۹ء) کی الفہرست کو قبول کیا جاتا ہے۔ خلدیؒ نے بیان سلاسل میں سات واسطوں سے رسول اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا ذکر کیا ہے: خواجہ جنید، خواجہ سقطی، خواجہ معروف کرخی، خواجہ فرقد، خواجہ حسن بصری، خواجہ انس بن مالک اور حضرت علی ابن ابی طالب۔ دقاقی (م۔ ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء) نے بھی اپنے سلسلۂ صوفیہ کا ذکر کیا ہے، جو خلدی کے بیان کردہ ناموں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ انھوں نے خواجہ معروف کرخی سے قبل خواجہ داود طائی کے نام کو شامل لیا ہے۔ عصر حاضر میں العیون کو متفقہ اسناد کی حیثیت کا حامل ہے جس کو صوفیہ کے تمام بڑے سلسلے قبول کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے: حضرت علی ابن ابی طالب، خواجہ حسن بصری، خواجہ حبیب عجمی، خواجہ داود طائی خواجہ جز جانی، خواجہ مغربی، خواجہ ابوعلی کاتب یاز جانی، خواجہ روزباری اور خواجہ جنید بغدادی۔ ابن الجوزی اور ذہبی نے اس سلسلہ روحانی پر اعتراض کیا ہے کہ اولین چاروں ولیوں کی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بعضوں کے نزدیک خواجہ معروف کرخی کے روحانی سلسلہ کو خواجہ بکر بن خنیس، ثابت البنان کے واسطے سے خواجہ حسن بصری تک پہنچانا زیادہ درست ہے۔ ۱۷

* تاریخ عرفانیت کے نقوش :

اسلامی عرفانیت کی تاریخ حیاتِ رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے شروع ہوتی ہے، جن کی ذاتِ مقدسہ تمام عارفین کے لیے منبع علم دین و سرچشمۂ روحانیت ہے۔ انھیں کی سرپرستی میں اولین جماعتِ عارفین امام المتقین حضرت علی مرتضیٰ کے گرد و پیش نظر آئی۔ حضرت سلمان فارسی حضرت ابوذر غفاری، حضرت عمار یاسر اور حضرت مقداد کے الگ الگ روحانی مدارج کا ذکر ملتا ہے کہ سلمانؓ دس مدارج میں دسوں پر، ابوذرؓ نو پر، عمارؓ آٹھ پر اور مقدادؓ سات پر فائز تھے۔ ان کے ایک درجہ میں کمیت و کیفیت کے فرق کا اندازہ اس فقرہ سے کیا جا سکتا ہے جو بہت سی حدیثوں میں نقل ہوا ہے: لَوْعَلِمَ اَبُوْذَرٍ مَا فِی قَلْبِ سَلْمان لَقَتَلَہ' (اگر ابوذر کو سلمان کے دل کی بات معلوم ہو جاتی تو انھیں [کافر سمجھ کر] قتل کر

دیتے۔) ۱۸؎ دیگر اہم عارفین میں حضرت اویس قرنی ہیں جنھوں نے محبت و مودتِ نبوی کی نادیدہ ناشنیدہ مثال قائم کر دی۔ مگر اتنا یقینی ہے کہ پہلی صدی ہجری (پانچویں صدی عیسوی) میں صوفیہ کی کوئی مخصوص جماعت نہیں تھی۔ البتہ نیک سیرت صحابۂ کبار اپنے اپنے زہد و تقویٰ اور عباداتِ الٰہی میں ممتاز و منفرد تھے۔ اسلامی تعلیمات اور اسوۂ حسنۂ رسالت مآب اور اہل بیت اطہار کی عملی زندگی میں ایسے عوامل موجود تھے جو نظری اعتبار سے عمیق و لطیف عرفانیت کی اساس اور عملی طور پر روحانی و معنوی مسرت کا سرچشمہ بن سکیں۔ نتیجہ میں بعد کے ادوار میں عرفانیت سے روحانی و معنوی مسرت کے چشمے جاری ہو گئے کہ اصطلاحی طور پر صوفیہ کا ذکر ملنے لگا۔ الکافی کی روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے دو (۱۱۷۔۹۴ھ/۷۱۲۔۷۳۵ء) میں کچھ افراد (سفیان ثوری اور ان کے ہمنوا) اس نام سے پہچانے جاتے تھے۔ ۱۹؎ شیخ ابونصر سراج طوسی (م: ۳۷۸ھ/۹۸۸ء)، ابوالقاسم قشیری (م: ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) نکلسن و دیگر ماہرین بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ اصطلاح دوسرے صدی ہجری کے اواخر میں جاری ہوئی۔

صوفی لقب سب سے پہلے ابو ہاشم بن شریک (م: ۱۵۰ھ/۷۶۷ء) اور جابر بن حیان (م: حدود ۱۶۰ھ/۷۷۶ء)) کے ناموں کا جزو بنا۔ یہ دونوں کوفی الاصل ہیں۔ انھیں اولین صوفی بھی قرار دیا جاتا ہے جو غیر صحیح ہے کیونکہ زمانی تقدم کے اعتبار سے خواجہ حسن بصری (م: ۱۱۰ھ/۷۲۸ء) کو اولیت حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک خواجہ حسن بصری کو اولین صوفی قرار دینا درست ہوگا۔ ان سے دوسری صدی ہجری میں تاریخ تصوف کا آغاز ہوتا ہے۔ خواجہ حسن بصری نے ۸۸ سال کی عمر پائی۔ گویا اپنی زندگی کی نو دہائیاں پہلی صدی ہجری میں گذاریں، فقط ایک دہائی دوسرے صدی ہجری میں گذری۔ انھیں نے تصوف کی پہلی کتاب رعایۃ حقوق اللہ لکھی، جس کا واحد نسخہ آکسفوڈ میں محفوظ ہے۔ اس میں متعدد اقوال نہج البلاغۃ سے ماخوذ ہیں۔ ابو ہاشم کوفی کو اولین صوفی ماننے کا سبب یہ تھا کہ پہلے ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں تھی، جو موجودہ تحقیق کے اعتبار سے ۱۵۰ھ/۷۶۷ء ہے۔ ۲۰؎ پہلے ان کے زمانہ کا تعین مشہور فقیہ امام سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ/۷۷۷ء) کے استاد ہونے کی بنیاد پر قیاساً کیا جاتا تھا، جو امام جعفر صادق کے شاگرد تھے۔ لیکن ابو ہاشم کوفی کے دیگر امتیازات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً انھوں نے سب سے پہلے رملہ فلسطین میں عابدوں، زاہدوں اور متقیوں کے لیے ایک خانقاہ بنائی تھی جس سے صوفیہ میں خانقاہیت کی داغ بیل پڑی۔ ۲۱؎ جابر بن حیان کو اسلامی حکمت کی تاریخ میں صبر کیمیا کی حیثیت سے امتیاز حاصل ہے۔

دوسری صدی کے صوفیہ میں زبیر بن مخزومی مکی (م: ۱۰۴ھ/۷۲۱ء) امام المتقین حضرت علی کے شاگرد حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگردِ رشید تھے، جنھوں نے اپنے استاد کی تفسیر قرآن کی تدوین کی تھی۔ مالک بن دینار (م: ۱۳۵ھ/۷۵۲ء) کو زہد و ترک لذت میں شدت کرنے کی بنا پر امتیاز حاصل ہوا۔ دیگر اہم ترین صوفیہ میں عباللہ بن خثیم کوفی (م: ۱۶۷ھ/۷۸۴ء)، ثابت البنانی (م: ۱۲۷ھ/۷۴۴ء) ۲۲؎ خواجہ حبیب عجمی (م: ۱۵۶ھ/۷۷۲ء) خواجہ ابواسحٰق ابراہیم ادھم (م: ۱۶۱ھ/۷۷۷ء) وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کے متبعین کا اپنا اپنا حلقہ تھا۔ خواجہ ابراہیم ادھم کا شاہِ بلخ ہونا اکثر مورخین غیر صحیح قرار دیتے ہیں لیکن صوفیہ انھیں مہاتما بدھ کے مماثل بزرگ مانتے ہیں جنھوں نے تخت و تاج ترک کر کے درویشی اختیار کی۔ ان کے بیٹے اور

خلیفہ شقیق بلخی (م:۹۴ھ/۸۰۹ء) بھی اہم صوفیہ میں ہیں۔انھوں نے امام موسیٰ کاظم سفر مکہ معظمہ کے دوران ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا جن کے متعدد کرامات بیان کرتے تھے۔خواجہ معروف کرخی (م:۲۰۰ھ/۸۱۵ء) اہم ترین صوفیہ میں ہیں۔ان سے متعدد روحانی سلاسل قائم ہوئے جن کو سلسلۃ الذھب کہا جاتا ہے۔ ان کے والدین عیسائی تھے۔انھوں نے امام رضا کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا تھا۔انھیں کی غلامی پر افتخار کرتے تھے۔شیخ فضیل بن عیاض (م:۱۸۷ھ/۸۰۳ء) پہلے ڈاکو تھے۔ایک رات ڈاکہ ڈالنے نکلے، کسی شب زندہ دار کی تلاوت قرآن کانوں میں پڑی۔دنیا ہی بدل گئی۔تائب ہوگئے۔امام جعفر صادق سے درس حاصل کیے۔ مصباح الشریعت لکھی جو ہنوز تصوف کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔دوسری صدی کی صوفیہ میں رابعہ عدویہ کو بجا طور پر روزگار خاتون کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے،۔خواجہ عبدالماجد زید بصری "(م:۱۷۷ھ/۷۹۳ء) بھی اسی صدی کے معروف صوفیہ میں تھے جن کے خوارق وکرامات کا بیان ملتا ہے۔

تیسری صدی ہجری کے صوفیہ میں خواجہ بایزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی (م:۲۶۱ھ/۸۷۴ء) کو اساسی اہمیت حاصل ہے جن سے متعدد روحانی سلاسل قائم ہوئے۔مشہور ہے کہ امام جعفر صادق کے گھر میں سقا تھے لیکن تاریخ سے اس دعویٰ کی تصدیق نہیں ہوتی۔شیخ بشر حافی (۲۶۲ھ/۸۴۰ء) پہلے فسق وفجور کے رسیا تھے۔ان کے 'حافی' کہلانے کا سبب یہ ہے کہ جب وہ توبہ کرنے کے لیے امام موسیٰ کاظم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ننگے پاؤں (حافی) تھے،بس اسی دن سے 'حافی' لقب ہوگیا۔ان کو بہت سی حدیثیں یاد تھیں لیکن روایت نہیں کرتے تھے۔ان کے احباب میں شیخ سری سقطی (م:۲۵۱ھ/۸۶۵ء) نے ۹۸ سال کی عمر پائی۔ ہر وقت الحمد اللہ سے توبہ کرتے رہتے تھے۔سبب دلچسپ ہے کہ ایک بار بازار میں آگ لگی جس میں ان کی دکان بھی تھی۔کسی سے اپنی دکان کی خیریت دریافت کی۔اس نے بتایا کہ آپ کی دکان بچ گئی۔زبان سے بے ساختہ الحمد اللہ نکل گیا۔بعد میں احساس ہوا کہ یہ میں نے کیا کیا۔اس لیے ہر وقت الحمد اللہ سے استغفار کرتے رہتے تھے۔شیخ سیری خواجہ معروف کرخی کے شاگرد ومرید اور خواجہ جنید بغدادی کے استاد اور ماموں تھے۔

خواجہ ابوالقاسم جنیدی بغدادی قواریری زجاج خراج (م:۲۹۷ھ/۹۰۹ء) نوے سال کی عمر پائی۔ نہاوند کے باشندہ تھے۔جس طرح فقہاء کی جماعت شیخ طوسی کو شیخ الطائفہ کہتی ہے،اسی طرح صوفیہ انھیں سید الطائفہ کہتے ہیں۔انھوں نے طریقت میں شریعت کا دامن نہ چھوٹنے دیا۔اس لیے بعض شطحیات،جو دیگر صوفیوں کی زبان پر جاری ہوئے،ان کی زبان پر نہ آسکے۔صوفیہ کا مخصوص لباس بھی نہیں پہنتے تھے بلکہ علماء وفقہاء کی طرح رہتے تھے۔کسی نے کہا،کبھی کبھار سہی خرقہ پہن لیا کریں۔جواب دیا،اگر لباس سے بن پڑتا تو میں لوہے کا لباس پہنتا۔۲۲ ان کے شاگردوں میں شیخ ممشاد دینوری (م:۲۹۹ھ/۹۱۱ء) کو قبول عام حاصل ہوا اور سلسلۂ چشتیہ کی بدولت شہرت دوام حاصل ہوئی۔علوم ظاہر و باطنی سے آراستہ تھے۔شیخ حارث محاسبی (م:۲۴۳ھ/۸۵۵ء) کے احباب میں تھے جو خواجہ جنید کے مصاحبوں میں تھے۔ان کے 'مصاحبی' کہلانے کا سبب یہ تھا کہ مراقبہ کے انتہائی پابند تھے۔ان کی امام حنبل (م:۲۴۱ھ/۸۵۹ء) سے پہلے دوستی رہی لیکن چونکہ امام حنبل علم کلام کے دشمن تھے اور شیخ حارث کو علم کلام سے رغبت تھی،اس لیے دوری

پیدا ہوگئی شیخ ذوالنون مصری (م:۲۴۵ھ/۸۵۹ء) کا نام ثوبان اور لقب ابوالفضل تھا۔ امام مالک (م:۱۷۹ھ/۷۹۵ء) کے شاگرد تھے۔ ابتدا عیسائی راہب تھے۔ انھوں نے رمزیہ زبان و اصطلاحات پر زور دیا جو بعد کے ادوار میں صوفیہ کی روش بن گئی۔ ان پر زندیق ہونے کا الزام لگا۔ ان کے اکثر شطحات فقہاء کے نشانہ پر تھے لیکن سزا سے بچ گئے۔ انھوں نے جدید افلاطونی فلسفہ کے متعدد مباحث تصوف میں داخل کیے۔ ۳۰ شیخ سہل بن عبداللہ تستری (م:۲۹۳ھ/۹۰۵ء) بھی ذوالنون مصری کے شاگردوں میں تھے۔ ان سے سلسلۂ سہلیہ شروع ہوا، جو مجاہدۂ نفس پر زور دیتا تھا۔ اسی صدی کے اہم صوفیہ میں شیخ منصور حلاج ہیں جن کا تفصیلی ذکر تصور اتحاد و حلول کے بیان میں ہو چکا ہے۔ شیخ علی بن محمد بن احمد علوی (م:۲۷۰ھ/۸۸۳ء) کو صاحب الزنج کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے جس کے پیرو اصحاب الزنج کہے جاتے ہیں۔ شیخ احمد بن خضرویہ (م:۲۴۰ھ/۸۵۴ء) مسلک ملامتیہ کے صوفی ہیں، جو شیخ حاتم اصم کے مرید و شاگرد تھے۔ شیخ ابوصالح حمدون قصار نیشاپوری (م:۲۷۱ھ/۸۸۴ء) بھی سلسلہ ملامتیہ کے صوفی تھے، جن کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ شیخ ابوحفص حداد نیشاپوری (م:۲۶۷ھ/۸۸۰ء) اور شیخ ابوسعید خراز (م:۲۸۷ھ/۹۰۰ء) بھی خوارق کے لیے مشہور ہیں۔ شیخ خراز سے سلسلہ خرازیہ شروع ہوا۔ شیخ یحییٰ بن معاذ رازی (م:۲۵۸ھ/۸۷۱ء) رے کے باشندہ تھے۔ ان صوفیوں میں تھے، جنھوں نے وعظ و نصیحت پر زور دیا۔

چوتھی صدی ہجری کے صوفیہ میں شیخ ابوبکر شبلی (م:۳۳۴ھ/۹۴۵ء) خواجہ جنید بغدادی کے شاگرد و مرید تھے۔ خراسان کے باشندہ تھے۔ انھوں نے رمزیہ زبان و اصطلاحات کو خصوصی اہمیت دی اور اسے منبر تک پہنچا دیا۔ شیخ ابوعلی رودباری (م:۳۰۲ھ/۹۱۴ء) ساسان النسل تھے، جن کا سلسلۂ نسب نوشیرواں عادل تک پہنچتا ہے۔ خواجہ جنید کے شاگرد و مرید تھے۔ انھیں شریعت، طریقت اور حقیقت کا جامع کہا گیا۔ شیخ ابونصر سراج طوسی (م:۳۷۸ھ/۹۸۸ء) کو ان کی کتاب اللمع کی بنا پر شہرت حاصل ہوئی، متعدد مشائخ براہ راست بالواسطہ ان کے شاگرد ہوئے۔ ان کے مشہور شاگرد و مرید شیخ ابوالفضل سرخسی (م:۴۰۰ھ/ ہیں۔ شیخ ابوطالب مکی (م:۳۸۵ھ/۹۹۵ء) کو ان کی کتاب قوۃ القلوب کی بنا پر زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اسی طرح شیخ ابوبکر محمد بن اسحٰق کلاباذی (م:۳۸۰ھ/۹۱۹ء) کو اپنی کتاب التعرف کی بنا پر شہرت حاصل ہوئی۔ شیخ ابوعبداللہ محمد بن خفیف (م:۳۷۱ھ/۹۸۱ء) شافعی المسلک تھے۔ اپنے دور و دور کے اکابر صوفیہ میں شمار ہوتے تھے۔

پانچویں صدی ہجری کے صوفیہ میں شیخ ابوالحسن خرقانی (م:۴۲۵ھ/۱۰۳۳ء) کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے بارے میں محیر العقول باتیں مشہور ہیں۔ مولانا روم ان کے معتقدین میں تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ شیخ خرقانیؒ شیخ بسطامی کی قبر پر جا کر ان کی روح سے رابطہ قائم کرتے اور ان سے اپنے مسائلِ تصوف کا حل حاصل کرتے تھے:

بوالحسن بعد از وفات بایزید — از پس آن سالہا آمد بدید
گاہ و بیگہ نیز رفتی بی فتور — بر سر گورش نشستی باحضور
تا مثال شیخ پیشش آمدی — تا کہ می گفتی شکاکش حل شدی

شیخ ابوسعید ابوالخیر (م:۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) شیخ سرخسی کے شاگرد و مرید تھے۔ فارسی رباعی گویوں

میں خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔ان کے نزدیک صوفی کی خصوصیت ہونا چاہئے کہ جو کچھ اس کے سر میں ہے، اسے نکال دے۔جو کچھ ہاتھ میں ہے اسے دیدے اور جو کچھ نازل ہوا ہو، اسے گذار دے۔ان کے وعظ میں بوعلی سینا (م:۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء) بھی شرکت کرتے تھے۔شیخ ابوعلی دقاق نیشاپوری (م:۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء) مناجات میں شدید گریہ کرنے کی بنا پر 'شیخ نوحہ گر' کہتے جاتے تھے۔جامع شریعت وطریقت قرار دیئے جاتے ھے۔شیخ ابوعبدالرحمٰن سلمٰی نیشاپوری (م:۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء) کا شمار اکابر صوفیہ میں ہوتا ہے۔ان کی تصنیف طبقات الصوفیہ مشہور ہے۔شیخ ناصح الدین ابومحمد چشتی (م:۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء) نے ستر سال کی عمر میں محمود غزنوی کے ہمراہ فتح سومناتھ میں حصہ لیا تھا۔خواجہ سید ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری (م:۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء) بھی پانچویں صدی ہجری کے اہم صوفیہ میں ہیں جن کا ذکر ہندوستانی صوفیہ میں کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔اس صدی کے اہم صوفیوں میں خواجہ عبداللہ انصاری تھے جو جلیل القدر صحابی حضرت ایوب انصاری کی اولاد میں تھے۔ہرات کے باشندہ تھے۔'پیر ہرات' مشہور ہیں۔ان کے بعض کلمے سکۂ رائج الوقت ہیں---- بچپن میں پستی، جوانی میں مستی، بڑھاپے میں سستی، پھر خدا پرستی کب؟ برائی کے بدلہ میں برائی کرنا، کتوں کی روش (سگ ساری) اچھائی بدلہ میں اچھائی کرنا، گدھوں کا کام (خرخاری) اور برائی کے جواب میں بھلائی کرنا، خواجہ عبداللہ انصاری کا شیوہ ہے! امام ابوحامد محمد غزالی (م:۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) مشہورترین اسلامی حکماء میں ہیں۔ان کی کتاب احیاء علوم اسلامی کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔

چھٹی صدی ہجری کے صوفیہ میں سب سے اہم شخصیت شیخ عبدالقادر جیلانی (م:۵۶۱ھ/۱۱۶۵ء) ہیں، جو ہندوستان میں 'بڑے پیر صاحب' کہے جاتے ہیں، گیلان کے باشندہ تھے، جس کا معرب 'جیلان' ہے۔ان سے سلسلۂ قادریہ شروع ہوا۔علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور تھے ان کی تصانیف میں فتوح الغیب، بشائر الخیرات اور طریق الحق زیادہ مشہور ہیں۔ایک دیوان بھی منسوب ہے۔دیگر اہم صوفیہ میں شیخ عین القضاۃ ہمدانی (م:۵۳۳ھ/۱۱۳۸ء) پرجوش صوفی تھے۔امام غزالی کے چھوٹے بھائی شیخ احمد غزالی کے شاگرد تھے، جو خود بھی جید صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں۔شیخ عین القضاۃ کو شطحات کے الزام میں کافر قرار دیا گیا۔قتل کر کے لاش جلا کر راکھ بنائی گئی و رہوا میں بکھیر دی گئی۔شیخ روزبہان بقلی شیرازی (م:۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء) کے بیانات بھی شطحیات سے لبریز ہوتے تھے، حتیٰ کہ 'شیخ شطاح' لقب ہوگیا، لیکن مفتیوں کے عتاب سے محفوظ رہے۔شیخ ضیاء الدین ابونجش عبدالقادر (م:۵۶۳ھ/۱۱۶۷ء) بھی شیخ احمد غزالی کے مرید وشاگرد تھے۔ان کے واعظ شیخ عبداللہ عمویہ بھی صوفی بزرگ تھے۔فارسی شعرا میں حکیم سنائی غزنوی (م:۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء) اور احمد جامی (م:۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء) کو تاریخ تصوف میں اہمیت حاصل ہے۔جامی کو 'ژندہ پیل' بھی کہا جاتا ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے صوفیہ میں شیخ نجم الدین کبریٰ (م:۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء) شیخ روزبہان بقلی کے شاگرد مرید اور داماد تھے۔انھوں نے بہت سے شاگردوں کی تعلیم وتربیت کی جن میں مولانا رومی کے والد شیخ بہاالدین اور شیخ سعدالدین حمویہ (م:۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) شامل ہیں۔ان سے سلسلہ کبرویہ جاری ہو۔ان کی رہائش خوارزم میں تھی۔خوارزم مغلوں کے حملوں کا نشانہ بنا تو شیخ نجم الدین کبریٰ کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے

مریدین کے ہمراہ شہر کے باہر آجائیں تاکہ انھیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ شیخ موصوف نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم نے آرام وسکون کا دور اہل خوارزم کے ہمراہ گذرا، مصیبت و آزمائش کے وقت میں ان کا ساتھ ترک نہیں کر سکتا۔ خود شیخ نے بھی مغلوں کے مقابلہ میں اسلحہ اٹھایا اور اپنی جان قربان کر دی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی زنجانی (م: ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین سہروردی (م: ۵۹۰ھ/۱۱۹۳ء) کے ہم نام ہونے کی بنا پر اکثر تسامح میں ایک ہی شخصیت قرار دیدیا جاتا ہے، حالانکہ دونوں کے سنین وفات میں ۴۲ سال کا فرق ہے۔ شیخ زنجانی کو اپنی تصنیف اعوارف المعارف سے شہرت حاصل ہے۔ شیخ الاکبر شیخ محی الدین ابن عربی کا ذکر وحدت الوجود کے سلسلہ میں کیا جاچکا ہے۔ ان کے شاگرد مرید اور سوتیلے بیٹے شیخ صدرالدین محمد قونیوی (م: ۶۷۲ھ/۱۲۷۲ء) تھے، جو ان کے افکار وخیالات کے بہترین مفسر تھے۔ ان کی اہم تصانیف میں النوح فی تحقیق الطور المخصوص، اللمعتہ النورانیہ فی مشکلات الشجرۃ النعمانیہ اور اعجاز البیان اہم ہیں۔ عربی شاعر ابن الفارض (م: ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) اور فارسی شعرا میں مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی (م: ۶۷۲ھ/۱۲۷۲ء) کی مثنوی کو زبانِ پہلوی میں قران سے نسبت دی گئی ہے۔ ان کے صوفیانہ تصورات ہر دور میں مقبول رہے ہیں۔ علامہ اقبال انھیں اپنا پیر ومرشد مانتے تھے۔ شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری (م: ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء) اپنی صوفیانہ مثنویوں منطق الطیر، اسرار نامہ، الٰہی نامہ، مصیبت نامہ اور تذکرۃ الاولیا کے لیے مشہور ہیں۔ شیخ فخرالدین (م: ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء) کا تخلص عراقی تھا، ہمدان میں پیدا ہوئے اور ملتان چلے آئے۔ شیخ بہاء الدین زکریا (م: ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء) اور شیخ قونیوی کے شاگرد تھے۔

آٹھویں صدی ہجری کے صوفیہ میں شیخ علاء الدولہ سمنانی کا ذکر وحدت الشہود کے تعلق سے ہو چکا ہے۔ دیگر صوفیوں میں سید حیدر آملی کی تصانیف میں جامع الاسرار اور نص النصوص اہم ہیں۔ شیخ محمود شبستری (م: ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) کی نظم گلشن راز، تصوف کے رموز بیان کرتی ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے موسس شیخ بہاء الدین نقشبند (م: ۷۹۱ھ/۱۳۸۸ء) کی تصانیف حیات نامہ اور دلیل العاشقین مشہور ہیں۔ آٹھویں صدی کے اہم ترین فارسی شاعر خواجہ حافظ شیرازی (م: ۷۹۱ھ/۱۵۸۳ء) کے حالات زندگی کی تفصیل نہیں ملتی لیکن ان کے عہد آفرین شاعر ہونے کے علاوہ صوفی، حافظ عالم اور مفسر قرآن ہونے میں کلام نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے اپنے ان صفات کی جانب بار بار اشارہ کیا ہے:

ندیدیم خوشتر از شعر تو حافظ — بہ قرآنی کہ اندر سینہ داری
عشقت رسد بہ فریاد گر خود بسان حافظ — قرآن زبر بخوانی با چاردہ روایت
ز حافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد — لطائف حکمی با نکات قرآنی

حافظؒ کے صوفیانہ تصورات کی متعدد بار وضاحت کی گئی ہے۔ محقق جلال الدین دوانی نے حافظ کے اس شعر کے صوفیانہ تصورات کی وضاحت میں ایک رسالہ لکھا ہے:

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت — آفریں بر نظر پاک خطا پوشش باد

نویں صدی ہجری کے صوفیہ میں شاہ نعمت اللہ ولیؒ (م: ۸۳۵ھ/۱۴۳۰ء) کو اولیت حاصل ہے۔

انھوں نے ۹۵ سال کی عمر پائی، جس کا بیشتر حصہ آٹھویں صدی میں گذرا۔ کرمان کے قصبہ ماہان میں ان کا مزار زیارت گاہ و مرجع عام و خاص ہے۔ اسی طرح کے دوسرے صوفی بزرگ شیخ شمس الدین محمد لاہجی نوربخشی اور امیر کبیر سید علی ہمدانی ہیں۔ ان تینوں روحانی سلسلوں میں اہ اہل تشیع اور اہل سنن دونوں ہیں۔ شیخ نوربخشی اور شاہ ہمدانی کے ذکر ہندوستان میں صوفیہ کے تذکرہ میں کیے جائیں گے۔ شیخ صائن الدین علی ترکہ اصفہانی کو محقق صوفیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی تصنیف تمہید القواعد تبحر و مہارت کی دلیل ہے۔ شیخ محمد بن حمزہ فناری رومی عثمانی مملکت کے علماء میں تھے۔ لیکن تصوف میں شہرت کا سبب ان کی تصنیف مصباح الانس ہے شیخ عبدالکریم جیلی (م:۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء) کی شہرت ان کی کتاب الانسان الکامل سے قائم ہے۔ شیخ عبدالرحمٰن جامی (م:۸۹۸ھ/۱۴۰۲ء) نے اکاسی سال کی عمر پائی جو صوفیہ میں اپنے مرشد شیخ بہاء الدین نقشبند سے بھی زیادہ اعلیٰ وارفع قرار دیئے گئے۔

* ہندوستان میں اکابر صوفیہ :

گذشتہ صفحات میں ان اکابر صوفیہ کا ذکر آچکا ہے جن کے بارے میں تفصیل سے جاننے کی خواہش ہوتی ہے لیکن تنگیٔ داماں کی مجبوری کی بنا پر یہاں چند اہم ترین اکابر صوفیہ کا ذکر ہی کیا جاسکے گا جنھوں نے ملکی دینی و روحانی زندگی میں انقلاب برپا کردیا۔ ان صوفیہ کے تعلق سے پہلی اہم بات یہ ہے کہ ان میں بیشتر کی آمد ایران، جزیرہ اور ماوراالنہر سے ہوئی تھی یعنی نظریاتی اعتبار سے یہ صوفیہ آریائی تصورات کے حامل تھے، محض چند صوفیہ ان علاقوں سے آئے جہاں سامی تصورات تھے۔ ہندوستانی عوام و خواص نے صوفیہ کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ صوفیہ کے زہد و تقویٰ نے دلوں کو مسخر کرلیا۔ ان کی کشادہ دلی نے سنگلاخ بنیاد پرستی کے حدود توڑ دیئے۔ اہل طریقت نے اہل شریعت کی متعدد پابندیاں ختم کردیں۔ ہندو عوام میں گھل مل گئے۔ ان سے انھیں کے انداز میں گفتگو کی۔ موسیقی سے سماع کی محفلیں آراستہ کیں۔ تصوف کا ایرانی و عربی پودا ہندوستانی سرزمین میں خوب خوب برگ و بار لایا۔ صوفیہ نے خلوص و یگانگت کے آبشار سے اس طرح سیراب کیا کہ تصوف کا ایرانی و عربی نوخیز پودا ہندوستان کی رزخیز زمین میں تناور چھتنار درخت بن گیا، جس کے فیوض و برکات کی ٹھنڈی چھاؤں میں تلاشِ حق کے مسافروں کو جائے امان حاصل ہوگیا۔ محبت و عقیدت کے تعطر سے چمن ہند مہک اٹھا اور مہک رہا ہے۔ صوفیہ سے عقیدت مندی میں ہندو عوام مسلم عوام سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ ان کے مواعظ میں اخلاص و احترام سے شریک ہوتے۔ ان سے متاثر ہوکر ہزارہا افراد نے اسلام اختیار کیا، لاکھوں نے اپنے آبائی مذہب و عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے صوفیہ سے اکتساب فیض روحانی کیا۔

صوفیائے کرام میں اہل تشیع کی طرح تقیہ کا عام رواج تھا تاکہ بعض سلاطین کے شدائد کا نشانہ بننے سے بچ سکیں۔ مزید برآں اپنا مافی الضمیر واضح الفاظ میں بیان کرنے کی بجائے رمز و کنایہ اور اصطلاحات کے پیرایے میں گفتگو کرتے تاکہ ان سے وابستہ لوگوں کے علاوہ کوئی غیر شخص ان کے اصل عندیہ تک نہ پہنچ سکے۔ سید علی ہجویری نے لکھا ہے کہ رمز و کنایہ اور اصطلاحات کے پیرایے میں گفتگو کرنے کا مقصد اپنی باتوں کو

غیروں سے مخفی رکھنا ہوتا تھا تا کہ اپنی بات کو اپنے دائرے کے اندر محدود رکھا جا سکے۔ان کا یہ طرزِ عمل انسانی فطرت کے مطابق تھا کیونکہ ہر شخص کی استعداد یکساں نہیں ہوتی، ہر شخص ہر بات کو نہیں سمجھ سکتا۔قرآن کا ارشاد ہے: وَ فَوقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْم (اور ایک سے بڑھ کر ایک دانا ہے: یوسف ۱۲/۷۶) ایسی تعلیمات کی جانب حضرت علی نے بھی اشارہ کیا ہے کہ لوگوں کو ان کے فہم کے مطابق احادیث سنایا کرو۔کیا تم چاہتے ہو کہ وہ اللہ اور رسول کی تکذیب کریں: بخاری، باب العلم، ۴۹) لیکن ہندوستانی صوفیہ میں تقیہ کی مخالفت بھی ہوئی۔سہروردیہ سلسلہ کے بانی سید جلال اعظم سرخ پوش (م:۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء) کے پوتے سید جلال الدین مخسین بخاری جہانیاں جہاں گشت (م:۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء) کے سگے چھوٹے بھائی سید صدر الدین راجو قتال (م:۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء) نے پہلی بار تقیہ کے خلاف تحریک چلائی کیونکہ ان کے خیال میں تقیہ کرنے کی بنا پر شیعوں کی اولاد اپنے آبائی مذہب سے محروم ہو کر عقیدہ اہل سنت قبول کر لیتی تھی۔لیکن بعض مصلحتوں کے پیش نظر تقیہ کا رواج باقی رہا۔حتیٰ کہ ۱۸ویں صدی کے اواخر تک اوچ کی خانقاہ نے اپنی شیعیت کا اعلان کر دیا۔[۲۴]

صوفیہ نے اہل بیت رسول کی مودت و محبت میں سرشار ہو کر مواعظ کہے، ملفوظات تحریر کیے، اشعار نظم کیے، ہر ممکن طریقہ سے اسلامی تبلیغ و اشاعت کرتے رہے لیکن ان کے پیغامات سب سے زیادہ محفل سماع کی بدولت عوام تک پہنچے۔ان محفلوں میں ہر شخص کو اپنے ذوق و شوق اور مزاج و کیفیت کا سامان مہیا تھا۔صوفیہ محفل سماع میں وجدانی کیفیتوں سے دوچار ہوتے تھے۔ لیکن کسی کو اگر محفل سماع سے بھی بڑھ کر حب اہل بیت میں سرشاری کی جستجو کرنا ہو تو صوفی قلندروں میں تلاش کی جا سکتی ہے۔یہ قلندر موسیقی اور نغمہ کے رسیا تھے۔انھوں نے حضرت علی اور اہل بیت رسول کی مدح و منقبت کے نغمے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں گانا شروع کر دیئے۔شیخ لال شہباز قلندر کی خانقاہ، سہوان سندھ (پاکستان) میں حضرت علی کی فضیلت کے نغمے بڑے شد و مد سے گائے جاتے ہیں ـــ دمادم مست قلندر، علی دا پہلا نمبر! تفصیلات سے قطع نظر روحانی و عرفانی حکایتِ دل پذیر مختصراً اس طرح بیان کی جا سکتی ہے:

ہندوستان میں صوفیہ کی اولین آمد خواجہ حسن بصری (م:۱۱۶ھ/۷۳۴ء) کے نام نامی سے معنون ہے۔حالانکہ اس کے تاریخی شواہد مفقود ہیں لیکن قرائن سے انکار نہیں کیا سکتا کیونکہ حیاتِ رسالت مآب سے ہی اہلِ ایمان کا تبلیغ دین کے تعلق سے دیارِ ہند میں آنا شروع ہو گیا تھا، جن میں کئی بزرگانِ دین خاک پاک ہند میں آسودہ ہیں۔ان میں ابو تمیم انصاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بعد وفات رسول ہندوستان آ گئے تھے۔ چنگئی (تمل ناڈ) سے ۵۰ ک م فاصلہ پر ملیا پورم (تمیم نگر) میں ساحل سمندر پر ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔دیگر صحابی شیخ عبد اللہ مکی اصحاب صفہ میں تھے، آسودۂ خاکِ پاکِ ہند ہیں۔عقیدت مندوں میں دادا حیات میر قلندر کے نام سے معروف ہیں۔ان کا مزار چک منگلور (کرناٹک) میں مختلف اہل مذاہب کے درمیان یکساں طور پر مقبول ہے۔ان دنوں ہندو انتہا پسندوں نے ان کو ہندو ریشی قرار دے کر مزار پر قبضہ کرنے کی مہم چلا رکھی ہے۔دیگر اہم صوفیہ میں عبد الرحمن اصطخری، ابو موسیٰ سندھی، محمد بن زیاد سندھی، ربیع بن صبیح، مکحول سندھی وغیرہ کے مزارات ہیں۔لیکن صوفیہ کی آمد کا تسلسل تاریخی اعتبار سے سلطان محمود غزنوی کے فتح ملتان

(۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء) کے بعد سے ملتا ہے۔ ہندوستان میں اولین صوفی شیخ صفی الدین گاذرونی (م: ۳۹۸ھ/ ۱۰۰۷ء) ہیں جو وادی اوچہ (سندھ) میں وارد ہوئے۔ وہاں انھوں نے پہلی بار اسلامی دارالعلوم قائم کیا، جس میں تقریباً ڈھائی ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ ان کی تشریف آوری سے متعلق حکایت ہے کہ ان کے چچا شیخ ابواسحٰق قزوینی (م: ۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء) نے اپنا خلیفہ نامزد کرنے کے بعد ان کا سامان ایک اونٹ پر سامان بار کر کے روانہ کر دیا کہ جس جگہ اونٹ رک جائے، وہی تمھارا مستقر ہے۔ وہ اونٹ وادی اوچہ (ملتان، پاکستان) میں رکا۔ یہ آمد ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء کے قریب ہوئی۔ ۲۵ اس واقعہ میں یہ مماثلت اہم ہے کہ اسی طرح رسول اللہ بھی مدینہ منورہ تشریف لائے تھے۔ جس جگہ اونٹ رکا، وہی مستقر قرار پایا۔ یہ سنت رسول کی پیروی ہو سکتی ہے، جس کی صوفی سے زیادہ توقع کی جا سکتی ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ سندھ پر مسلمانوں کی حکمرانی دور محمد بن قاسم (۹۶-۹۳ھ/۱۴-۷۱۱ء) سے قائم ہو چکی تھی۔ ابتدا میں بعض علماء و صلحاء بھی وارد ہند ہوئے لیکن بعد کے ادوار میں پھر سوفیہ کی آمد تقریباً تین صدی تک کیوں نہ ہو سکی۔ اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ محمد بن قاسم کا دور ہنگامی و عبوری تھا جس کے بعد زیدیوں اور اسماعیلیوں کی حکومت شروع ہو گئی۔ حالانکہ زیدیہ و اسماعیلیہ بھی شیعی فرقے تھے۔ ان کے اور صوفیہ کے درمیان اثنا عشری شیعوں کے برعکس ہم آہنگی نہیں تھی۔

سلطان التمش کے دورِ حکومت (۳۶-۱۲۱۱ء) میں نہ صرف یہ کہ صوفیہ کی آمد تیز ہوئی بلکہ ان کے پاؤں سرزمینِ ہند پر قائم ہو گئے کہ ان کو اربابِ حکومت کے سفید و سیاہ میں دخل حاصل ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ سلطان محمد غوری کے نائب ناصر الدین قباچہ کے خلاف شیخ بہاؤ الدین زکریا (م ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء) کی شکایت پر التمش نے قباچہ حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ سلطان التمش کو مشائخ و صلحاء سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ ان سے انتہائی تعظیم و تکریم سے پیش آتا تھا۔ شیخ جلال الدین تبریزی دہلی تشریف لائے تو التمش نے علماء و مشائخ کے ہمراہ بیرون شہر جا کر استقبال کیا۔ ان کو دیکھتے ہی گھوڑے سے اتر آیا، انھیں آگے کر کے خود پیچھے پیچھے چلا۔ قاضی قطب الدین کاشانی کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ گیا، سلام کیا اور اپنے پاس بٹھایا۔ قاضی حمید الدین ناگوری سے جماعتِ مفتیان خفا تھی۔ ان سے التمش نے وعدہ کیا تھا کہ ان کی تعظیم و تکریم نہیں کرے گا۔ لیکن ان کو دیکھتے ہی ہی مفتیوں سے کیا گیا اپنا وعدہ بھول گیا۔ اپنے تخت سے نیچے اتر آیا اور لپک کر ہاتھوں کو بوسہ دینے لگا۔ سلطان غیاث الدین بلبن (۸۷-۱۲۶۶) بھی اہل حال کا انتہائی عقیدت مند تھا۔ شیخ علی نے دہلی سے چشت واپس جانے کا ارادہ کیا تو بلبن نے ان کے قدموں پر گر کے قسم کھائی کہ اگر آپ چشت تشریف لے گئے تو میں اپنی سلطنت ترک کر کے آپ کے رکاب میں چلوں گا۔ بلبن خواجہ فرید الدین گنج شکر اور شیخ فرید الدین ترک پانی پتی کی خدمت میں حاضر ہوتا تو دست بستہ ایستادہ رہتا۔ سلطان علاء الدین خلجی (۱۳۱۶-۱۲۹۲ء) کو خواجہ نظام الدین اولیاء سے ایسی بے پناہ عقیدت تھی کہ اپنے دو بیٹوں خضر خاں اور شادی خاں کو حلقۂ ارادت میں دے دیا تھا۔ ان کی محفلِ سماع کے اشعار سن کر اپنا سر دھنتا اور کہتا ــــــ سر سے پاؤں تک آلودۂ گناہ کو اس پاک نفس سے ملاقات کرنے میں شرم آتی ہے! سلطان فیروز شاہ (۸۸-۱۳۵۱ء) بھی صوفیہ کا انتہائی معتقد تھا۔ خواجہ جہانیاں جہاں گشت ہر دوسرے تیسرے سال دہلی آتے۔ سلطان شہر کے باہر سے استقبال کرتا۔ محل میں ملاقات کے لیے آتے تو سلطان تخت پر کھڑا ہو جاتا، اپنے ساتھ بیٹھاتا، رخصت

ہوتے تو محل کے باہر تک آ کر رخصت کرتا۔ جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہوتے وہیں کھڑا رہتا۔ ایک بار سلطان حاضر خدمت ہوا، خواجہ عبادت میں مصروف تھے۔ سلطان دیر تک خاموش کھڑا رہا کہ خواجہ نماز سے فارغ ہو جائیں۔

ہندوستان میں صوفیہ کے روحانی فیضان کا تسلسل اس وقت قائم ہوا، جب مسلک جنیدیہ کے صوفی بزرگ شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی نے اپنے شاگرد شیخ حسین زنجانی (م: ۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء) کو لاہور میں خدمت دین پر مامور کیا، پھر اپنے نوجوان شاگرد سید ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری کو شیخ زنجانی کی معاونت پر مامور کیا۔ سید علی ہجویری نے عذر کیا کہ وہاں ایک بزرگ پہلے سے موجود ہیں لیکن شیخ ختلی اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ سید علی ہجویری لاہور آئے۔ رات میں شہر میں داخل ہوئے۔ اسی رات شیخ حسین زنجانی کا انتقال ہو گیا۔ لاہور کے نواح 'چاہ میراں' میں مدفون ہیں۔ دوسری روایت مختلف ہے، جس کے مطابق شیخ زنجانی سید علی ہجویری کی وفات کے بعد تک حیات رہے۔ حتیٰ کہ خواجہ معین الدین چشتی نے لاہور میں ان کے ساتھ قیام کیا۔[۲۷]

خواجہ سید علی محمد ہجویری (م: ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) کی کنیت ابوالحسن تھی۔ غزنی کے دو گاؤں 'ہجویر' اور 'جلاب' میں ابتداً سکونت کرنے کی بنا پر 'ہجویری' یا 'جلبی' کہلائے۔ چوتیس برسوں تک لاہور میں رہ کر علمِ ظاہری و باطنی کی اشاعت کرتے رہے، لہٰذا لاہوری بھی کہے گئے۔ ان کے والد عثمان بن ابوعلی جلابی درویشِ کامل، عالمِ متبحر اور مصنف تھے۔ ساداتِ کبار میں تھے۔ خواجہ سید علی محمد ہجویری کو تاریخ صوفیہ میں متعدد پہلوؤں سے اہمیت حاصل ہے۔ حالانکہ ان کی متعدد تصانیف تھیں لیکن ان میں کشف المحجوب، ہی دستِ بردِ زمانہ سے محفوظ رہ سکی ہے۔ یہی تنہا کتاب ان کے بقائے دوام کی ضامن ہے۔ اس کو تصوف کے آئین کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے مختلف ادوار کے صوفیہ اکتساب فیض کرتے رہے ہیں۔۔ خواجہ معین الدین چشتی نے کسب فیض کے لیے ان کے مزار پر چلہ کشی کی اور رخصت کے وقت یہ شعر نذر کیا تھا:

گنج بخش فیضِ عالم، مظہرِ نورِ خدا ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

اس کے بعد سے کو داتا گنج بخش کا لقب سید علی ہجویری کے نام کا جزو بن گیا۔ خواجہ فرید الدین گنج شکر نے بھی آپ کے مزار پر چلہ معکوس کیا تھا۔[۲۸] لاہور میں ان کا روضہ سلطان ناصر الدین محمود غزنی (۹۷-۱۰۳۰ء) کے بیٹے ظہیر الدولہ نے تعمیر کرایا اور اکبر اعظم (۱۶۰۵-۱۵۵۶ء) نے خانقاہ اور ڈیوڑھی بنوائی۔ ہنوز مرجع خاص و عام ہے۔ شہزادہ دارا شکوہ اپنے زمانہ کا حال لکھا: 'خلقی انبوہ بر شب جمعہ بزیارت آں روضہ منورہ مشرف می گردید و مشہور است کہ ہر کہ چہل شب جمعہ یا چہل روز پیہم طواف روضہ شریفہ ایشاں بکند، ہر حاجتے کہ داشتہ باشد حصول می انجامد۔' علامہ اقبال بھی مدح سرا ہیں:

سید ہجویر مخدوم امم مرقد او پیر سنجر را حرم
بندہائے کوہسار آساں گسیخت در زمین ہند تخم سجدہ ریخت
پاسبانِ عزتِ ام الکتاب از نگاہش خانۂ باطل خراب

ہندوستان میں تصوف کو صوفیائے چشتیہ کی بدولت قبول عام حاصل ہے۔ تصوف اور صوفیائے

چشتیہ معانی و مفاہیم میں لازم و ملزوم بن گئے۔ ہندوستان میں تصوف کی تاریخ صوفیائے چشتیہ کے گراں قدر کارناموں کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستان میں تصوف کی تاریخ ہی صوفیائے چشتیہ کی تاریخ ہے۔ ان کے روحانی مراکز برصغیر کے تینوں ممالک، بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش پر محیط ہیں۔ یہ طریقت علویہ کا روحانی سلسلہ خواجہ ممشاد دینوری (م: ۲۹۹ھ/۹۱۱ء) کے وسیلہ سے صوفیہ کے ممتاز ترین سلسلۃ الذہب میں شامل ہے۔۲۹؎ حالانکہ اس کے موسس خواجہ الحق شامی (م: ۳۲۹ھ/۹۴۰ء) ہیں لیکن لقب چشتیہ خواجہ ابو احمد ابدال چشتی (۳۵۶ھ/۹۶۶ء) کی نسبت سے ہوا۔ یہ سلسلہ روحانی چشت میں مقبول نہ ہو سکا اور خواجہ مودود چشتی (م: ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء) کے خلفاء میں خواجہ احمد، خواجہ رکن الدین اور خواجہ حاجی شریف کے ساتھ اختتام پذیر ہو گیا۔ البتہ خواجہ حاجی شریف کے خلیفہ خواجہ عثمان ہردانی نے نیشاپور میں سکونت اختیار کر لی۔ باقی چشتیہ صوفیہ نے خانہ بدوش درویشوں کی زندگیاں اختیار کر لی۔ چشت کا روحانی مرکز بھی ترک قبائل کے جنگ و جدل کا مرکز بن گیا۔ اس علاقہ میں امن و امان اس وقت بحال ہوا جب سلطان غیاث الدین محمد (۱۲۰۳-۱۱۲۳ء) سلطنت غور کا حکمران ہوا۔ اس کا دارالسلطنت فیروزکوہ تھا جہاں علماء و فقہا، شعرا و ادباء وغیرہ کھنچ کر آگئے۔ اس نے فیروزکوہ میں مسجد بنائی اور ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ لیکن فیروزکوہ کی فضا صوفیہ سے ہم آہنگ نہ تھی۔ اس کے بھائی سلطان شہاب الدین معزالدین سام معروف بہ محمد غوری نے ۶۰۰ھ/۱۲۰۳ء میں اپنے جاں نثار غلام سپہ سالار قطب الدین ایبک کو نائب السلطنت بنا کر ہندوستان میں شنسبانی حکمرانی کی بنیاد ڈالی۔ سلطان محمد غوری کے امیر فوج مقتدر صوفی بزرگ میراں سید حسین خنگ سوار (م: ۵۹۸ھ/۱۲۰۱ء) تھے۔ ایبک نے انھیں سلطنت غوری کی سرحد کے قریب اجمیر کا قلعہ دار بنایا۔ نسبی افتخار، علم و فضل اور اعلیٰ عہدہ سے زیادہ زہد و تقویٰ اور اپنے روحانی کشف کی بنا پر مقبول تھے۔ ان کا مزار تارا گڈھ (اجمیر) میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ ان کے بھتیجے سید حسن مشہدی کی صاحبزادی عصمۃ اللہ کا عقد خواجہ معین الدین چشتی سے ہوا تھا۔

دہلی میں اولاً شیخ ابو بکر طوسی کی خانقاہ کا ذکر ملتا ہے جو قلعۂ کہنہ کے قریب ٹیلہ پر واقع تھا۔ شیخ نورالدین مُلک یارپرّاں (م: ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) جو شیخ دانیال جُجی کے مرید تھے، لاہور سے آئے اور وہیں قیام پذیر ہوئے تو شیخ ابو بکر نے منع کیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا نوشتہ دکھلایا۔ شیخ ابو بکر نے کہا، طغرائے شاہی بھی لا کر دکھاؤ۔ شیخ نورالدین نے ۱۳۰ میل کا سفر طے کر کے سلطان بلبن کا فرمان پیش کر دیا۔ اسی دن سے 'مُلک یارپرّاں' لقب ہو گیا۔ تمام عمر وہیں رہ کر رشد و ہدایت کرتے رہے اور اسی ٹیلہ پر مدفون ہوئے۔ شیخ ابو بکر طوسی کی خانقاہ دہلی کی مقبول خانقاہوں میں تھی جس کی محفل سماع میں اکابر صوفیہ شریک ہوتے تھے۔ سلطان غازی کے نام سے مشہور سلطان ناصرالدین محمود (م: ۶۶۹ھ/۱۲۹۹ء) کا شمار بھی صوفیہ میں ہوتا ہے۔ شاہ ترکان (م: ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) ہروقت عالم استغراق میں رہتے تھے، ان کے مزار کی نسبت سے ترکمان دروازہ ہنوز مشہور ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی سجزی (م: ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) کی ہندوستان میں تشریف آوری اور پھر سرزمین ہند میں ہی سکونت اختیار کرنا تاریخ صوفیہ میں ہی نہیں۔ ہندوستانی روحانی تاریخ کا باعث افتخار باب

ہے بقول مولانا غلام علی آزاد: "ہندوستان بہ یمن قدم میمنت لزوم طریقہ اسلام ظاہر گشت وسیاہی کفر وشرک ازعرصہ روزگار بزدود" ہندوستان میں اجمیر موصوف کی نسبت سے 'اجمیر شریف' ہوگیا، ان کے مولد قصبہ چشت (خشت) کو رتبہ ملا کہ اس کی نسبت سے 'خواجہ چشت' کہلائے۔ ورنہ چشت ہرات سے قریب ہری رود کے ساحل پر واقع ایک قریہ ہے اور کیا! جس پر غوری حکومت کے قیام سے قبل مختلف خراسانی گورنر حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ چشت کے قدیم باشندے بدھ مت کے پیرو تھے، جن کو یہودیوں نے نکال باہر کیا اور ان کے مال واملاک پر قابض ہوگئے۔ یہودیوں کو مانیوں نے مار بھگایا اور بالآخر مسلمانوں نے مانیوں کو مشرف بہ اسلام کر لیا لیکن ان میں بعضوں نے ترک وطن کو ترجیح دی۔ مجموعی طور پر علاقہ چشت میں مسلمانوں کی آبادیاں ہوگئیں۔ اسی بنا پر چشتی صوفیہ کی تعلیمات میں سامی تصورات اور آریائی تصورات کی آمیزش نظر آتی ہے، جو مختلف النوع ہیں۔ اسی آمیزش کی بدولت وسیع النظری، کشادہ قلبی اور انسان دوستی کو چشتی صوفیہ نے تصوف کے بنیادی تصورات میں شامل کیا جو سلسلہ چشتیہ کی بے پناہ مقبولیت کا سبب بنا۔[۳۲]

خواجہ معین الدین کی ولادت میں بجستان (سیستان) میں اور پرورش وپرداخت خراسان میں ہوئی ہے۔ ان کے والد سید غیاث الدین حسن متقی وخدا ترس بزرگ تھے۔ بیٹے کی عمر پندرہ سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نوجوان معین الدین نے کسی مجذوب صوفی سے متاثر ہوکر آبائی جائیداد فروخت کرکے غربا ومساکین میں تقسیم کردی۔ کئی برسوں تک قرآن واحادیث اور معقولات ومنقولات کا مطالعہ کرتے رہے۔ وہاں سے نیشاپور کے نواح میں ہروان گئے، خواجہ شیخ عثمان ہروانی کی نگرانی میں ڈھائی سال تک راہ سلوک طے کرتے رہے۔ شیخ عثمان اس نوجوان صوفی سے بیحد متاثر ہوئے۔ اپنے خرقہ وخلافت سے سرفراز کیا۔ خواجہ بغداد کے سفر پر روانہ ہوئے اور سنجان میں سلسلہ کبرویہ کے موسس شیخ نجم الدین کبریٰ سے ملاقات کی۔ تھوڑے عرصہ تک ان کے ساتھ قیام کیا، پھر وہاں سے جل (گل) آئے اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے ہمراہ آٹھ ہفتوں تک قیام کیا۔ وہاں سے بغداد کے لیے روانہ ہوئے۔ اس بار ان کے ہم سفر سلسلہ سہروردیہ کے موسس شیخ شہاب الدین سہروردی، ان کے عم واستاد شیخ ضیاء الدین اور شیخ اوحادالدین تھے بغداد سے ہمدان آئے اور شیخ یوسف ہمدانی سے ملاقات کی۔ وہاں سے تبریز جاکر شیخ ابوسعید تبریزی سے ملاقات کی۔ پھر میہان اور خرقان گئے تاکہ شیخ ابوسعید بن ابی الخیر خرقانی کے مزار کی زیارت کرسکیں۔ وہاں سے استرآباد آئے اور شیخ نصیرالدین استرآبادی کے مزار پر حاضری دی۔ استرآباد سے ہرات گئے اور خواجہ عبداللہ کے روضہ کے قریب قیام کیا۔ کسی ایک جگہ مستقل قیام کی بجائے ہرات کے گرد ونواح میں گشت کرتے رہے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم ساتھ ہوگیا۔ خواجہ نے سب کو چھوڑا اور سبزوار آگئے۔ سبزوار کا شیعی امیر محمد یادگار حلقہ ادارت میں شامل ہوگیا۔ وہاں سے حصار شادمان آئے۔ محمد یادگار کو وہیں چھوڑا۔ اس دور کے نامور متکلم مولانا ضیاء الدین حکیم کو علم تصوف کا قائل کیا۔ وہاں سے بلخ آئے۔ پھر غزنی گئے، شمس العارفین شیخ عبدالواحد سے ملاقات کی جو شیخ نظام الدین ابوالمجید کے استاد ومرشد تھے۔ وہاں سے لاہور آئے اور شیخ علی ہجویری کے مزار پر چلہ کش ہوئے۔ پھر دہلی اور آخرش اجمیر میں اقامت گزیں ہوگئے۔

مذکورہ بالا کوائف سفر پر نظر ڈالی جائے۔ جن کی تفصیلات نہیں ملتی، تو خواجہ معین الدین چشتی کی

روحانی شخصیت کے اہم پہلوؤں کا تعارف ہوتا ہے۔ مثلاً انھوں نے اپنے دور کے بزرگ ترین صوفیہ سے ملاقاتیں کی تھیں۔ یہ ملاقاتیں محض رسمی نہیں ہوسکتیں۔ مقتدر ترین صوفیہ کی باہمی ملاقاتیں روحانی کسب واکتساب سے بڑھ کر مسائل ومباحث پر تبادلہ خیالات پر مبنی ہوتی ہوں گی۔ اتنے عرصے تک مسلسل سفر کرنے سے مختلف ومتضاد لوگوں سے سابقہ ہوا ہوگا، جس سے روحانی فکر نے کئی جہتیں حاصل کی ہوں گی۔ وسیع المشربی، انسانیت نوازی اور حق پرستی کے جدید معانی ومفاہیم سے ہم آہنگی ہوئی ہوگی لیکن افسوس ہے کہ ہمارے سوانح نگار کو شخصیت کے ان پہلوؤں سے دلچسپی نہیں ہوتی، بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کا غلبہ پیش کرنے کی دھن میں صوفیہ کو 'غازی میاں' بنا دیتا ہے۔ حکمراں طبقہ تحصیل ووصول اور فتوحات کے نشہ میں سرشار نظر آتا ہے تو سوانح نگار اپنے جذبۂ تبلیغ کو صوفیہ پر مسلط کر کے ان کے پیغام ایمان وایقان کو جبریہ تبدیلی مذہب کی جدوجہد بنا دیتا ہے، حالانکہ علماء اور صوفیہ کے تبلیغ دین میں بنیادی فرق یہی ہے کہ علماء وفقہاء دلائل سے قائل کر کے شرف بہ اسلام کرتے ہیں ان لوگوں کو جو تبدیلی مذہب نہیں کرتے صوفیہ ان کو بھی راہ سلوک میں ساتھ لے کر چلتے تھے تاکہ اس کے قلب وروح میں شمع ایمان روشن ہوسکے۔ خواجہ معین الدین چشتی کا طریقہ کار بھی یہی تھا کہ اپنے اعلیٰ ترین روحانی کردار سے قلب وروح کی گہرائیوں میں اترتے تھے۔ قیام اجمیر کے قلعہ کے دوران لوگ ان کے حسن کردار سے متاثر ہوکر سچے مسلمان ہوگئے۔ ایک بار کسی درویش ان سے سوال کیا، صحیح تقویٰ کی کیا شناخت ہے؟ خواجہ نے جواب دیا کہ شرعی امر ونہی کا پابند ہونا۔ حکم خدا کی پابندی کرنا۔ ان باتوں سے پرہیز کرنا جن کی ممانعت ہے۔ طریقت کے نو اصول بیان کیے۔ اپنے شاگرد شیخ حمید الدین ناگوری کو حکم دیا کہ ان شرطوں پر قلم بند کردو تاکہ مسلمانوں کا وسیع حلقہ واقف ہوسکے۔ طریقت کے درج ذیل نو اصول ہیں، صلا نورتن ہیں:

(۱) مال ودولت نہیں کمانا چاہئے۔
(۲) دوسروں سے قرض نہیں لینا چاہئے۔
(۳) دست سوال نہیں دراز کرنا چاہئے، خواہ سات دنوں کے فاقہ سے کیوں نہ ہو۔
(۴) افراط سے کھانا، دولت، غلہ، لباس وغیرہ مہیا ہوجائے تو بچا کر نہیں رکھنا چاہئے۔
(۵) کسی کو صدمہ نہیں پہنچانا چاہئے۔ اگر کسی سبب سے صدمہ پہنچ ہی جائے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے کہ اس کے دشمن کو راہ حق کی ہدایت کرے۔
(۶) کوئی کار خیر انجام پائے تو اسے اپنے پیر کی دعا یا رسول مقبول کی شفاعت یا اپنے رب کا کرم سمجھنا چاہئے۔
(۷) کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اسے خود کو ذمہ دار ٹھہرانا چاہئے۔ گناہ سے پرہیز کرنا اور خدا سے خوف کھانا چاہئے۔
(۸) ان شرائط کی پابندی کے بعد دن میں روزہ اور رات عبادت میں بسر کرنا چاہئے۔
(۹) خاموش رہنا چاہئے، حتیٰ کہ بولنا لازمی ہوجائے۔ شریعت میں طول کلامی کی ممانعت کی ہے۔ انھیں الفاظ کا استعمال کرنا چاہئے جن سے اللہ تعالیٰ راضی وخوشنود ہوسکے۔

ان نو اصولوں کی آفاقیت عیاں ہے جن کو کردار سازی کے رہنما اصول کہا جا سکتا ہے۔ یہ نو اصول کسی بھی شخص کی بہتر زندگی کے رہنما اصول ہو سکتے ہیں، خواہ وہ مسلم ہو، غیر مسلم ہو، یا کسی مذہب کا پابند نہ ہو۔ خواجہ کے تصورات کا دیگر اہم محور عشق ہے، جس کے دو پہلو ہیں: معشوق اور عاشق عشق اپنی وسعت میں بحر بیکراں ہے۔ معشوق اپنے حسن و جمال میں آفتاب کی طرح ہے اور عاشق اپنے عجز و انکسار میں زمین کی ہے۔ بہترین عبادت فاقہ کشوں کو سیر و سیراب کرتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی نے ستانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ اجمیر میں اسی جگہ دفن کیے گئے، جہاں زیادہ تر رہتے تھے۔ خواجہ حسین ناگوری نے روضہ تعمیر کرایا۔ محمود خلجی نے ۱۴۵۵ء میں بلند دروازہ بنوایا۔ سلطان مالوہ نے مسجد تعمیر کرائی، جس میں جہاں گیر اور اورنگ زیب نے توسیع کی۔ اکبر اعظم شہزادہ سلیم کی ولادت پر اظہار تشکر کے لیے پا پیادہ آگرہ سے اجمیر آیا۔ فروری ۱۵۷۰ء میں پہنچا۔ کافی مال و دولت نذر کی۔ اس سے وراثت کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ اکبر نے کافی غور و خوض اور تحقیق کے بعد شیخ محمود کو متولی مقرر کیا، جنھوں نے انتظامیہ کو چست و درست کر دیا۔ خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ تقرب الٰہی، معرفت حق، انسان دوستی، خلوص و محبت اور ایثار و قربانی کی اعلیٰ ترین مثال قرار دی جا سکتی ہے، جہاں لاکھوں کی تعداد میں ہر سال زائرین بلا امتیاز مذہب و ملت، صنف و سال اور رنگ و نسل، ہندوستان سے اور بیرون جات سے حاضر ہو کر آستان بوس ہوتے ہیں۔

شاہانِ مغلیہ کو صوفیہ سے ایسی دلی عقیدت تھی کہ بسا اوقات ان سے ملاقات میں آداب شاہی سے بے نیاز ہو جاتے، کسی عام حاجت مند کی طرح دامن طلب پھیلا دیتے۔ ان کو دربار میں طلب کرنے کی بجائے صوفیہ کے آستانوں پر خود حاضر ہوتے۔ بابر نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو کر ہدایت کا خواستگاری کی تھی۔ انھوں نے ہدایت فرمائی کہ عدل پر قائم رہے۔ علماء کو دوست رکھے انھیں منصف مقرر کرے۔ اوامر و نواہی کی پابندی کرے و با جماعت نماز ادا کیا کرے۔ اکبر اعظم کی شیخ سلیم چشتی سے عقیدت مندی مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ شہزادہ سلیم کی ولادت پر اظہار تشکر کے لیے پا پیادہ آگرہ سے اجمیر گیا۔ راستہ بھر روپے اور اشرفیاں لٹاتا رہا۔ فروری ۱۵۷۰ میں اجمیر پہنچا۔ شیخ سلیم سے عقیدت میں شہزادے کا نام سلیم رکھا لیکن سوے ادب کا خیال سے نام لے کر نہیں پکارتا تھا بلکہ اسے 'شیخو بابا' کہتا تھا۔ شیخ سلیم کے جاے قیام کو مبارک قرار دے کر فتح پور سیکری میں دلکش شہر آباد کیا، جس کو تمام شہروں کا سرتاج بنا دیا۔ اجہاں گیر نے توزک میں شیخ سلیم سے اکبر اعظم کی والہانہ عقیدت کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اکبر اعظم نے شیخ سلیم سے بہ اصرار ان کے زمانۂ وصال کے بارے میں دریافت کیا۔ شیخ سلیم نے کہا، جب شہزادہ تعلیم کی گئی باتوں کو یاد کر کے دہرانے لگے گا۔ اکبر اعظم نے تمام معلموں کو ہدایت کر دی کہ شہزادہ کو نثر و نظم کی کوئی ایسی چیز کی تعلیم نہیں دی جانا چاہیے، جسے یاد کیا جا سکے۔ ایک دن کسی نے شہزادے کو شعر یاد کرا دیا:

الٰہی غنچہ امید بکشا گلے از روضۂ جاوید بنما

شہزادے سے یہ شعر سننے کے چند دنوں بعد شیخ سلیم نے انتقال کیا۔ اورنگ زیب کی سنگلاخ بنیاد پرستی کی داستانیں عام ہیں لیکن اسے بھی صوفیہ سے بیحد عقیدت تھی۔ اورنگ زیب نے شاہ عبدالرحیم کو دربار میں مدعو کیا۔ انھوں نے جواب میں لکھ بھیجا: ''جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے دفتر سے

اس کا نام کٹ جاتا ہے ---! اورنگ زیب ان کے خط کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ تنہائی میں اس خط کو بار بار پڑھتا اور روتا تھا۔[۳]

اوچہ کو تصوف کے اہم مراکز میں شمار کیا جاتا ہے۔ جو بھول پور (پاکستان میں پچاس کلومیٹر کے فاصلہ پر ستلج و چناب کے سنگم پر واقع ہے۔ قدیم میں سندھ کا پایۂ تخت تھا لیکن روحانی تقدس مخدوم سید جلال الدین حسین بخاری جلال اعظم شیر شاہ (م: ۶۹۰ھ/۱۶۹۱ء) خلیفہ اجل شیخ بہاؤ الدین زکریا سہروردی کی بدولت حاصل ہوا۔ جو سادات نقوی میں تھے۔ امام علی نقی کے بیٹے جعفر تواب سے سلسلہ نسل وابستہ ہے: سید جلال الدین حسین بن علی بن جعفر بن محمد اول فتح بن محمود اصغر بن احمد ابو یوسف بن عبداللہ بن علی اصغر بن جعفر تواب بن امام علی نقی۔ جعفر تواب (م: ۲۷۱ھ/۸۸۴ء) لقب ہونے کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا تو جعفر کذاب کہلائے، جب توبہ کر لی تو جعفر تواب ہوئے۔ ان کے بیٹے کا نام علی اصغر (م: ۳۲۰ھ/۹۳۲ء) اور لقب علی الاشقر تھا کیونکہ ان کے بال سرخ تھے۔ بغداد میں سید النقبا تھے۔ ان کے بیٹے عبداللہ (م: ۳۶۳ھ/۹۷۳ء) کے فرزند سید محمد انجواد (م: ۴۲۲ھ/۱۰۳۰ء) خواجہ نظام الدین اولیاء کے جد ہیں۔ پہلے یہ خاندان بغداد میں تھا۔ بعد میں سید محمد (م: ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء) ترک وطن کر کے بخارا آئے۔ بخارا میں ہی سید جلال اعظم کے دادا سید جعفر بن سید محمد (م: ۵۷۵ھ / ۱۱۷۵ء) اور والد سید علی ابو المویدآسودہ ہیں۔ سید جلال اعظم کے مختلف القاب ہیں: منیر شاہ، میر سرخ، شریف اللہ، جلال اکبر، مخدود اعظم، عظیم اللہ، ابو البرکات، ابو محمد، میر بزرگ وغیرہ۔ ان القاب سے تقدس و بزرگی اور مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ سید جلال اعظم نے ۹۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ان کے فرزند خلیفہ مخدوم سید احمد کبیر (م: ۷۱۴ھ/۱۳۱۴ء) علوم ظاہر و باطن میں کامل تھے۔ ان کے بھائی سید صدر الدین محمد غوث اور بھتیجے سید بہاؤ الدین حلیم بن سید علی سرمست کا شمار اہل کمال میں ہوتا تھا۔ ان کے مزارات اوچہ میں ہیں۔ اولاد برصغیر میں پھیلی ہوئی ہے۔ مخدوم سید احمد کبیر کے فرزندوں میں جہانیاں جہاں گشت اور سید صدر الدین راجو قتال تاریخ صوفیہ کی اہم شخصیتیں ہیں۔

ہندوستان میں سلسلۂ سہروردیہ کی ابتدا شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے خلفاء کی آمد سے ہوئی، جن کے مرشد شیخ ضیاء الدین ابو نجیب اور دادا پیر شیخ وجیہ الدین تھے، جو ہمدان اور زنجان کے درمیان واقع سہرورد کے باشندہ تھے اور اسی نسبت سے سہروردی کہلائے۔ لیکن ہندوستان میں سلسلۂ سہروردیہ کو رائج و مقبول کرنے میں شیخ بہاء الدین زکریا، شیخ جلال الدین تبریزی، قاضی حمید الدین ناگوری اور سید نور الدین مبارک غزنوی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ شیخ بہاء الدین زکریا (م: ۶۶۱/۱۲۶۲ء) کے اجداد مسلم بن قاسم کے ہمراہ وارد ہند ہوئے تھے اور یہیں بس گئے۔ بہاء الدین زکریا کی ولادت کوٹ کرور (نزد ملتان) ہوئی تھی۔ انھوں نے بارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کیا اور مزید تعلیم کے لیے خراسان گئے، وہاں بخارا گئے، جہاں حسنِ سیرت کی بنا پر 'ملک' (فرشتہ) کہے گئے۔ پھر حج و زیارات کے لیے مکہ و مدینہ گئے اور علم الحدیث میں مہارت حاصل کی۔ وہاں سے بغداد گئے اور بانی سلسلہ سہروردیہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ حالانکہ یہ رفاقت محض سترہ دنوں تک محدود تھی لیکن شیخ شہاب الدین عمر اس نوجوان صوفی کو

خلعت خلافت سے سرفراز کردیا۔ وہاں سے نیشاپور ہوتے ہوئے ملتان واپس ہوئے۔ ملتان کے علماء وصوفیہ نے ان کا ملتان میں قیام پسند نہیں کیا، لیکن انھوں نے ملتان کو مستقر بنالیا۔ شیخ زکریا کے تعلقات ہم عصر چشتیہ صوفیہ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے انتہائی خوشگوار تھے۔ انھوں نے چشتیہ کی طرح مسلسل روزہ کی تلقین نہیں کی، البتہ سماع میں کبھی کبھار شرکت کرتے تھے۔ چشتیوں کی طرح فقر و فاقہ کی بجائے دولت و حشمت کے ساتھ خانقاہی زندگی بسر کی۔ حتیٰ کہ موقع پڑنے پر امیر ملتان کی بھی مالی امداد کرتے تھے۔ موصوف سلطان التمش (۱۲۱۰-۳۵ء) کے حامیوں میں تھے بلکہ انھوں نے بھی مقامی قاضی کی شمولیت میں سلطان کو خط لکھ کر ملتان پر حملہ آور ہونے کی دعوت کی تھی۔ جب سلطان التمش نے ۱۲۲۸ء میں ملتان پر قبضہ کرلیا تو یہ تعلقات مزید استوار ہوگئے۔ شیخ جلال الدین تبریزی کے خلاف شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی شکایت پر سلطان التمش نے مخصوص محضر (مجلسِ علماء وفقہاء) منعقد کی، تو اس کی صدارت شیخ بہاء الدین زکریا نے کی اور اس کے نتیجہ میں شیخ نجم الدین صغریٰ شیخ الاسلام کے عہدہ سے معزول ہوئے اور یہ خطاب وعہدہ بھی شیخ بہاء الدین زکریا کو ملا۔

شیخ بہاء الدین زکریا کے خلفاء نے، جس خوبی سے سلسلۂ سہروردیہ کو قائم ومقبول کیا، خود شیخ سہروردی کے خلفاء بھی نہ کرسکے۔ شیخ زکریا کے ایک مشہور ومعروف خلفاء میں سید جلال الدین بخاری معروف بہ جلال سرخ پوش (م: ۶۹۰ھ/۱۶۹۱ء)، شیخ حسن افغان (ناخواندہ تھے لیکن شیخ نظام الدین اولیاء کے ممدوح تھے۔) اور مشہور فارسی شاعر شیخ فخر الدین عراقی (م: ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء) وغیرہ تھے لیکن شیخ زکریا نے اپنے بیٹے شیخ صدر الدین عارف (م: ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء) کو اپنا جانشین بنایا۔ شیخ زکریا نے دولت کثیر ورثہ میں چھوڑی تھی۔ ان کے سات بیٹے تھے۔ تنہا صدر الدین عارف کے ترکہ میں سات لاکھ ٹنکے تھے۔ انھوں نے اپنا حصہ راہ خدا میں دیدیا۔ شیخ صدر الدین عارف کو خوش نصیبی سے شیخ امیر حسن بن عالم بن ابی الحسن الحسینی (م: ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء) کی طرح کا عالم متبحر خلیفہ ملا، جن کی تصانیف میں نزہۃ الارواح، کنز الرموز، معرکۃ، طرب المجالس، زاد المسافرین، ہفت گنج وغیرہ مشہور ہیں۔ شیخ عارف کے مشہور خلیفہ شیخ احمد معشوق تھے جو شراب خواری ترک کرکے پیر طریقت بنے تھے۔ شیخ عارف کے بیٹے اور خلیفہ شیخ رکن الدین ابوالفتح (م: ۱۳۲۴-۲۵ء) تھے، جو سلطان علاء الدین خلجی کے دور (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) میں دوبار دہلی گئے۔ دونوں بار بادشاہ نے دسات سات لاکھ ٹنکے نذر کیے۔ دونوں بار خواجہ نظام الدین اولیاء سے ملاقات کی۔ دونوں ایک دوسرے کے معترف ومداح تھے۔ شیخ ابوالفتح کی خلافت وجانشینی کے لیے ان کے بھتیجے شیخ اسمٰعیل اور پوتے شیخ حمد کے درمیان رسہ کشی ہوئی، جس کا مقدمہ سلطان محمد بن تغلق (۱۳۲۵-۵۱ء) کے دربار تک گیا، شیخ حمد جانشین مقرر ہوئے لیکن بعد میں مغلوں سے سازباز کرنے کے جرم میں موت کی سزا ملی۔ اس طرح ملتان کی خانقاہ تباہ وبرباد ہوگئی لیکن ملک کے دیگر علاقوں میں شیخ بہاء الدین زکریا کے خلفاء کی خانقاہیں پھلتی پھولتی رہیں۔

قاضی حمید الدین ناگوری (م: ۶۷۲ھ/۱۲۷۴ء) نے دہلی میں سلسلۂ سہروردیہ قائم کیا۔ ان کا اصلی نام محمد بن عطا تھا۔ ان کے والد سلطان محمد غوری کے عہد میں بخارا سے آئے تھے۔ حمید الدین کی ولادت دہلی

میں پوئی۔ مروجہ علوم متداولہ حاصل کرنے کے بعد حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ بخارا میں شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے۔ بغداد میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملاقات ہوگئی جو تمام عمر بہترین رفاقت کی شکل میں قائم رہی۔ دونوں بزرگوں میں ذوقِ سماع مشترک تھا۔ سلطان التمش کے صدرِ جہاں محمد صادق اور دیگر علماء نے سلطان التمش کو ورغلا کے محضر منعقد کرائی لیکن ناکام رہے۔

قاضی حمید الدین ناگوری کو اپنے علم و فضل کی بنا پر شہرت حاصل ہوئی۔ ان کو سہروردیہ کے پہلو بہ پہلو چشتیہ صوفیہ بھی یکساں اہمیت حاصل ہے۔ خواجہ اجمیری کی حیات میں ہی شاگردِ رشید کی حیثیت سے امتیاز حاصل تھا۔ ایک بار خواجہ نے اپنے تمام شاگردوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے دعا کرو۔ سب نے بہت کچھ مانگا۔ شیخ حمید الدین نے دستِ سوال دراز نہ کیا۔ خواجہ نے پوچھا، تم نے کیوں نہیں مانگا۔ شیخ نے جواب دیا، میں نے خود کو راہ خدا میں دیدیا ہے، اب بچا ہی کیا ہے، جس کے لیے مانگوں؟ خواجہ نے خوش ہوکر 'سلطان التارکین' کا لقب عطا کیا، جو نام کا جزو بن گیا۔ حالانکہ ان کے مسلک میں فتوت نقد قبول کرنے کی ممانعت نہیں تھی لیکن شیخ ناگوری نے اپنا رویہ مختلف رکھا۔ ناگور کے قصبہ سوالی میں ان کے پاس تھوڑی سی مزروعہ زمین تھی اور ایک گائے تھی، اسی پر مدارِ زیست تھا۔ ان کا تصور تھا کہ انسان کو کسی ذی روح کو نقصان پہنچانے کا حق نہیں ہے۔ گوشت خوری پسند نہ تھی۔ اپنے مریدوں کو گوشت خوری ترک کرکے سبزیوں کو غذا کرنے پر زور دیتے تھے۔ اپنے انتقال سے قبل وصیت کردی کہ ایصال ثواب میں ایسا کھانا تقسیم کیا جائے، جس میں گوشت نہ ہو۔ حاضرین میں کسی نے ازراہِ تفنن کہا کہ اگر گوشت خریدا جاچکا ہو تو؟ مسکرا کے جواب دیا، اس صورت میں قصاب ایک اور جانور ذبح کرے گا تاکہ اپنے دوسرے گاہکوں کو گوشت دے سکے، جو مجھے گوارہ نہیں۔ تمام شرعی مسائل و مباحث پر عالمانہ دست رس رکھتے تھے۔ جہالت کو سب سے بڑا گناہ قرار دیتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ احکام شریعۃ سے واقف ہونا اور مرتکب گناہ ہونا، ایک گناہ ہے لیکن احکام شریعۃ سے ناواقف ہونا اور مرتکب گناہ ہونا، دو گناہ ہیں۔ قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ پر خاص زور دیتے تھے: فاینما تولوا فثم وجہ اللہ (تم جس جگہ بھی قبلہ کا رخ کرلو گے سمجھو وہیں خدا موجود ہے) اس کی تفسیر میں کہتے تھے کہ انسان کو خدا تک پہنچنے کے لیے علائق دنیا میں ہر چیز ترک کردینا چاہئے اور بس خدا سے لو لگانا چاہئے۔ جہاں جائے، اس کا چہرہ خدا کی جانب ہو، جو کچھ کہے خدا سے کہے، جو کچھ مانگے، خدا سے مانگے۔ خدا انسان سے دور نہیں ہے، انسان خدا سے دور ہے۔ عرفانِ ذات سے حق شناسی کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہ دروازہ کوئی اور نہیں کھول سکتا، انسان خود کھولتا ہے، لیکن وہ جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا کرے۔ جنت اور دوزخ کا مدار انسان کے اپنے کردار و عمل پر ہے۔ راہ خدا کے مسافروں کی اپنی راہ نہیں ہوتی۔ ان کے خصوصی تعلقات خواجہ بختیار کاکی سے قائم رہے جن کی محفل سماع میں بھی شامل ہوتے تھے۔

قاضی حمید الدین ناگوری کے چار خلفا ہوئے۔ چاروں پس ماندہ طبقہ کے تھے۔ شیخ احمد نہروانی جولاہے تھے، شیخ شاہی لُوتیب، نائی تھے جن سے خواجہ نظام الدین اولیاء دعا کے طالب ہوئے۔ شیخ عین الدین قصاب تھے اور خواجہ محمد میاں دُز، درزی تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوری کے پوتے اور خلیفہ شیخ فرید

الدین محمود ناگوری (م۔۱۳۳۳ء) کا لقب 'چاک پرّ ان' تھا۔ سلطان محمد بن تغلق (۱۳۲۵۔۵۱ء) کے دربار میں اہم مقام رکھتے تھے۔ ناگوری مرکز روحانی کا ذکر خواجہ حسین ناگوری کے ذکر کے بغیر نامکمل رہ جائے گا جو شیخ حمید الدین کے خاندان اور شیخ فرید الدین کے صاحبزادے شیخ کبیر الدین کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ انھوں نے مقامی کاشکاروں کی سی زندگی بسر کی اور جو کچھ حاصل ہوا خواجہ معی الدین چشتی اور قاضی حمید الدین ناگوری کے مزارات کی تعمیر میں صرف کر دیا۔

سید نور الدین مبارک غزنوی (م: ۳۵۔۱۲۳۴ء) سلسلۂ سہروردیہ شہرت یافتہ صوفی تھے۔ سلطان التمش سے 'شیخ الاسلام' کا خطاب حاصل تھا، اور دہلی میں 'میر دہلی' کہلاتے تھے۔ ۱۱۰ اسلام ملوکیت کے جتنا خلاف ہو، یہ ملوکیت کے زبردست حامی تھے۔ سلطان کو 'دین پناہ' مانتے تھے۔ اس کے اصول بھی وضع کیے تھے جن کی پیروی تمام مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیے تھے۔ اپنی سنگلاخ بنیاد پرستی میں وہ غیر سنی مسلمانوں کو مسلمان نہیں مانتے تھے۔ ان کے اصول درج ذیل ہیں:

(۱) بادشاہ کو شریعت نافذ کرنا چاہیے۔ کفر و شرک اور بت پرستی کو نابود کر دینا چاہیے۔ اگر کفر کو نابود کرنا ممکن نہ ہو تو ہندؤں اور دیگر بت پرستوں اور مشرکوں کی توہین کرنا چاہیے۔ ان کو خاص کر برہمنوں کوئی عہدہ و ذمہ داری نہیں سپرد کرنا چاہیے۔

(۲) گناہ، آوارگی و شراب خوری اور طوائفیت کی علانیہ اجازت نہیں ہونا چاہیے۔ اگر طوائفیں تائب نہیں ہوتیں تو چھپ کر پیشہ کریں۔ طوائفیت کو یکسر ممنوع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بہ صورت دیگر آوارہ گرد مسلم عورتوں کی عصمت دری کر سکتے ہیں۔

(۳) نفوذ شریعت کی خدمت ماہرین شریعت و طریقت کے سپرد ہونا چاہیے۔ فلسفہ کو ممنوع اور تعلیم فلسفہ کو جرم قرار دینا چاہیے۔ اہل تشیع، جو گمراہ اور اہل کفر کے ازلی دشمن ہیں ان کی توہین کرنا چاہیے اور انہیں کوئی سرکاری عہدہ نہیں دیا جانا چاہیے۔

(۴) عدل کو بالادستی حاصل ہونا چاہیے، جو اسی صورت میں ممکن ہے کہ بادشاہ حکومت کے ذریعہ جبر کے خوف کو ختم کر سکے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کے اہم خلفاے ہند میں شیخ جلال الدین تبریزی (م: ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء) نے بنگال کو اپنا مستقر بنایا۔ انھوں نے کئی علمی و روحانی مراکز پر درس حاصل کیے تھے۔ وہ اور ان کے والد شیخ ابوسعید تبریزی سے بیعت تھے لیکن تحصیل علم کے لیے بغداد پہنچے اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات ہوئی تو انہیں کے ہو کر رہ گئے۔ سات برسوں تک کسی خدمت گار سے بڑھ کر خدمت کی۔ ان کا کھانا گرم رکھنے کی غرض سے انگیٹھی سر پر اٹھائے سات برسوں تک سفر و حضر میں پیر کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ شیخ جلال الدین نے شیخ بہاء الدین زکریا کے ساتھ بغداد سے نیشاپور کا سفر کیا تھا۔ دونوں صوفیہ متضاد الطبع تھے۔ راستہ میں ہر منزل پر شیخ بہاء الدین مراقبہ و عبادت کرتے لیکن شیخ جلال الدین مقامی درویشوں سے ملاقات میں زیادہ دلچسپی لیتے۔ ایک بار مشہور صوفی شاعر شیخ فرید الدین محمد عطار نیشاپوری (م: ۶۲۷ھ/۱۲۲۹ء) سے ملاقات کر کے لوٹے تو اتنے مبہوت تھے کہ شیخ بہاء الدین سے کہہ دیا کہ اب تو شیخ سہروردی کی شبیہ بھی مراقبہ

میں نہیں اٹھ رکی۔ شیخ بہاء الدین انتہائی خفا ہوئے اور رفاقت ترک کر دی۔ شیخ جلال الدین تنہا ملتان وارد ہوئے، لیکن جلد ہی دہلی آگئے۔ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ مخالف ہو گئے۔ کردار کشی پر اتر آئے۔ محضر منعقد ہوئی، جس کے صدر نشین ان کے مخالف شیخ بہاء الدین زکریا ہوئے، لیکن انھوں نے انصاف کا ہاتھ بالا رکھا۔ شیخ نجم الدین صغریٰ خطاب شیخ الاسلام سے معزول ہوئے۔ انھوں نے بھاگ کر بدایوں میں پناہ لی۔ شیخ جلال الدین بھی بدایوں ہوتے ہوئے بنگال پہنچے اور پہلے لکھنوتی میں خانقاہ قائم کی، پھر وہاں سے دیو محل (دیوتلہ) سوئے، جو شمالی بنگال میں پنڈوا کے قریب واقع ہے۔ وہاں خانقاہ و مدرسہ قائم کیا۔ بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندو و مسلم یکساں طور پر عقیدت رکھتے تھے۔ دوتلہ تبرزیز آباد ہو گیا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کے دیگر خلفائے ہند میں مولانا مجد دین حجی، شیخ ضیاء الدین رومی، شاہ ترکمان ہیں۔ سلسلہ سہروردیہ کی خانقاہیں بھی سلسلہ چشتیہ کی طرح سراسر ہند میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں ان کے موسسین شیخ بہاء الدین زکریا اور شیخ جلال الدین تبریزی ہیں۔ شیخ بہاء الدین زکریا کی بدولت سلسلہ سہروردیہ اوچ و ملتان سے گجرات، پنجاب، کشمیر اور دہلی تک پھیلا۔ شیخ جلال الدین تبریزی نے بنگال کو مرکز قرار دے کر سلسلہ سہروردیہ کی خانقاہیں پورے بہار اور مشرقی اتر پردیش تک پھیلا دیں۔

سلسلہ چشتیہ کے اہم ترین صوفیہ اور ارشد تلامذہ خواجہ اجمیری میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م۔ ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء) میں تھے لیکن خواجہ اجمیری کی حیات میں ہی رحلت ہو جانے کی بنا پر خلیفہ و جانشین، ہو سکے ورنہ انھیں کا سب سے زیادہ استحقاق تھا۔ ان کی ولادت اوش (فرغانہ) میں ہوئی تھی، جو حلاجی صوفیوں کا مرکز تھا۔ اٹھارہ ماہ کا سن تھا کہ ان کے والد کمال الدین احمد موسیٰ کا انتقال ہو گیا۔ ماں نے تربیت کی۔ اپنے پڑوسی مولوی کے پاس قرآن پڑھنے کے لیے بٹھانا چاہا۔ ملازمہ کے ذریعہ قطب الدین کو پڑوسی مولوی کے مدرسے بھیجا لیکن یہ شیخ ابا حفص کے مدرسے میں پہنچ گئے۔ روایت ہے کہ راستہ میں خواجہ خضر ملے اور انھوں نے شیخ ابو حفص کے مدرسے میں پہنچا دیا۔ (صوفیہ کے ذکر میں اکثر خواجہ خضر وارد ہوتے رہتے ہیں!) ان سے قرآنی تعلیم مکمل کر کے بغداد گئے۔ مسجد میں خواجہ معین الدین چشتی سے ملاقات ہوئی اور ان کے گردیدہ ہو گئے۔ حالانکہ اسی شہر میں شیخ عبدالقادر بھی موجود تھے اور ان سے شرف ملاقات بھی حاصل کیا تھا۔ بغداد سے خراسان ہوتے ہوئے آئے اور شیخ بہاء الدین زکریا سے ملاقات کی جو دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ ۶۱۸ھ/ ۱۲۲۱ء کے اواخر میں دہلی وارد ہوئے۔ سلطان التمش نے کھلے دل سے استقبال کیا۔ شیخ الاسلام کا عہدہ پیش کیا لیکن انھوں نے معذرت کر لی۔ بعد میں شیخ الاسلام کا عہدہ شیخ نجم الدین صغریٰ کو تفویض ہوا۔ شیخ الاسلام کے عہدہ نے شیخ نجم الدین کے مزاج میں رعونت بھر دی۔ ابتداً انھوں نے خواجہ قطب الدین میں ہم آہنگی رکھی، پھر رقابت شروع کر دی۔ خاص طور پر مسئلۂ سماع پر اختلافات اتنے بڑھے کہ خود خواجہ اجمیری کو بیچ بچاؤ کے لیے دہلی آنا پڑا۔ تمام دہلی مع مشائخ دست بوسی کے لیے حاضر ہوئے لیکن شیخ نجم الدین صغریٰ نہ آئے۔ خواجہ اجمیری بہ نفسِ نفیس شیخ الاسلام شیخ نجم الدین صغریٰ کے دولت خانہ پر تشریف لے گئے لیکن وہاں بھی اغماض و بے توجہی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجبوراً خواجہ اجمیری کو فیصلہ کرنا پڑا کہ خواجہ قطب الدین دہلی سے ہٹا کر اجمیر میں اپنے پاس رکھیں۔ ان کو لے کر اجمیر کے لیے واپس ہونے لگے تو عقیدتمندوں کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ لوگ

گرد راہ کو آنکھوں میں لگانے لگے۔ سلطان التمش بھی ان عقیدت مندوں میں شامل تھا۔ اہل دہلی مع مشائخ عظام کے اصرار مجبور ہو کر خواجہ اجمیری نے انھیں دہلی میں ہی ہدایت کے لیے چھوڑ دیا۔۵۸ خواجہ بختیار کاکی تمام عمر دہلی میں ہی رہے۔ ان کی بدولت دہلی چشتیہ صوفیہ کا مرکز بن گیا۔ خواجہ بختیار کاکی اپنی پوری زندگی الفقر و فخری کے اصول پر کاربند رہے۔ کاکی، (روٹی والے) لقب کا سبب یہ ہے کہ روٹیاں ملنا بھی اللہ پہ توکل تھا۔۵۹ سماع سے بیحد شغف تھا۔ ایک بار قوال نے مشہور صوفی شیخ احمد جامی (م:۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء) کا ایک شعر پیش کیا:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　　　ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

خواجہ بختیار کاکی پر وجد طاری ہو گیا۔ اسی عالم میں گھر لائے گئے۔ جب تک زندہ رہے۔ یہی شعر سنتے رہے تا اینکہ اپنی جان ہی جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کا روضہ مہرولی (دہلی) میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ ان کے شاگردوں میں شیخ بدرالدین کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر معروف بہ بابا فرید (م:۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء) شیخ معین الدین چشتی کے بعد ان کے خلیفہ و جانشین ہوئے۔ شیخ فریدالدین مسعود کے بزرگ خواجہ قطب الدین گ بارہویں صدی میں کابل سے ہجرت کر کے پنجاب میں آباد ہوئے۔ ان کے والد قاضی شعیب غزنوی حکمرانوں کی جانب سے کھتوال کے قاضی تھے، جو ملتان میں مہران اور اجودھن کے درمیان واقع ہے۔ ان کی والدہ عبادات و روحانیت کی دلدادہ تھیں جن کی تربیت نے تصوف کی طرف مائل کیا۔ ملتان میں ہی مولانا منہاج الدین ترمذیؒ کے مدرسہ میں منقولات و معقولات کی درسیات کے دوران خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے حلقہ ادارت میں شامل ہو کر بیعت کر لی۔ پھر قندھار جا کر مزید تعلیم حاصل کی اور دہلی واپس آ کر خواجہ بختیار کاکی کے جماعت خانہ کے اہم رکن بن گئے۔ وہیں جماعت خانہ کے نزدیک ایک حجرہ میں رہنے لگے۔ خواجہ اجمیری دہلی تشریف لائے تو بابا فرید کے زہد و تقویٰ سے اتنے خوش ہوئے کہ اپنے شاگردوں کے ہمراہ اپنی مخصوص عبادات میں شامل کر لیا۔ خلوت گزینی مزاج میں شامل تھی، اس لیے جب دہلی میں غیر معمولی مقبولیت راہ سلوک میں مخل ہونے لگی تو ہانسی (ضلع حصار) چلے گئے۔ پھر وہاں سے اس وقت لوٹے کہ خواجہ بختیار کاکی وفات پا چکے تھے۔ خواجہ حمیدالدین ناگوری نے خواجہ بختیار کاکی کے متبرکات، خرقہ وغیرہ حسب وصیت بابا فرید کے سپرد کر دیے۔ دہلی سے ہانسی واپس ہوتے ہوئے اجودھن، پاک پتن ضلع ساہیوال (پاکستان) آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بابا فرید کے قیام اجودھن میں رقابتوں اور سیاسی ریشہ دوانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اجودھن کے قاضی اور دیگر اراکین حکومت نے ان کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن جب علماء و فقہاء کو معلوم ہوا کہ یہ فتویٰ بابا فرید کے خلاف لیا جا رہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر ان کو شہید کر دینے کی سازش ہوئی۔ اُلغ خان اعظم غیاث الدین بلبن (۸۷-۱۲۶۶ء) نے سلطان ناصرالدین محمود (۶۶-۱۲۴۶ء) کو بے دخل کر کے سلطنت دہلی پر قبضہ کیا تھا۔ بابا فرید کو سلطان ناصر الدین کا مربی قرار دے کر بلبن ان کا دشمن بن گیا۔ اس کا ابن عم شیر خان گورنر ملتان تھا، اس نے پابندی عاید کر دی کہ باب فرید کو عوام سے فتوحات نہ مل سکے۔

بابا فرید کی زندگی زہد وتقویٰ، عبادت اور خدمت خلق سے عبارت تھی۔ فقر وفاقہ معمول میں تھا۔ ایک بار مسلسل روزہ رکھے۔ افطار کے لیے کچھ میسر نہ تھا۔ چند سنگ ریزے منہ میں ڈال لیے، سنگ ریزے بھی دانۂ نبات کی طرح شیریں لگے، 'گنج شکر' لقب ہوگیا۔ مٹی کا ایک مکان جماعت خانہ کے نام سے بنایا تھا، جس میں لوگوں کی ضیافت ومہمان داری بھی ہوتی اور ذکر خدا بھی۔ مسلمان صوفیہ اور قلندر بھی آتے اور ہندو یوگی اور سادھو سنت بھی۔ مسائل ومباحث پر کھل کر بحثیں ہوتیں۔ ان میں ناتھ یوگیوں سے مباحثوں کا ذکر خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات میں موجود ہے۔ امیر خسرو نے بابا فرید کے پانسو دوہے مرتب کیے ہیں، جن میں بعض دوہوں کو سکھوں کی مقدس کتاب 'گرو گرنتھ صاحب' میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے بابا فرید کے وسیع المشربی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بابا فرید اپنے مریدوں سے بیعت لیتے ہوئے کہتے تھے--- تم نے بیعت کی اس ضعیف کے ہاتھ پر، اس کے شیخ اور شیخ کے مشائخ کے ہاتھوں پر اور حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھ پر اور حضرت پیغمبر صلعم کے دست مبارک پر اور اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ اپنے ہاتھ، پاؤں اور آنکھوں کی حفاظت کروگے اور شریعت کی راہ اور طریقہ پر ثابت قدم رہوگے۔ بابا فرید کے خلفاء کی تعداد کثیر تھی، جن میں 'خلافت اولیٰ' شیخ نظام الدین اولیا کو حاصل ہوئی۔ 'خلافت اولیٰ' کو اصطلاح صوفیہ میں 'خلافت رحمانی' کہتے ہیں۔ دوسرا روحانی سلسلہ شیخ مخدوم صابر کلیری سے شروع ہوا۔ ان دونوں سلاسل کی خانقاہیں سراسر ہند میں پھیلی ہوئی ہیں۔

خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی (م: ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) چودھویں صدی کے اہم ترین صوفیہ میں تھے، جو مختلف الابعاد شخصیت کے حامل تھے۔ عارف کامل، انتہائی متقی وعبادت گذار، عالم متبحر، مفسر ومحدث، فقیہ ومعقولی اور ادیب وشاعر تھے۔ دہلی میں ان پر علماء وفقہاء، صوفیہ ودرویش، امراء ورؤساء اور عوام الناس پروانہ وار نثار رہتے تھے۔ ان کے اجداد بخارا سے آکر بدایوں میں آباد ہوگئے تھے۔ وہیں ان کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی زندگی عسرت وناداری میں گذری۔ ذوق علم دہلی کھینچ لایا۔ پھر اجودھن گئے۔ بابا فرید نے ہمت افزائی کی اور راہ سلوک کی تعلیم دی کہ روزہ سے آدھی راہ سلوک طے ہوتی ہے اور باقی آدھی راہ عبادات وزیارات سے۔ دوبارہ اجودھن گئے تو بابا فرید سے قرآن واحادیث اور دیگر اہم کتابیں پڑھیں۔ انھوں نے اپنا خلافت نامہ عطا کیا اور حکم دیا کہ دہلی کی واپسی میں اسے ہانسی (حصار) میں مولانا جلال الدین اور دہلی میں قاضی منتخب الدین کو دکھا دینا۔ رخصت کے وقت بابا فرید نے فرمایا--- تم ایک تناور درخت بنوگے جس کے سایہ میں انسانوں کو عافیت ملے گی۔ خدمت سے اپنی طاقت میں اضافہ کرو۔ میں اپنی تمام چیزیں تمھارے سپرد کررہا ہوں کیونکہ تم میری وفات کے وقت موجود نہیں ہوگے۔ خواجہ نظام الدین نے دہلی آکر فیض عام کا دروازہ کھول دیا۔ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت کا عام دروازہ کھول رکھا تھا۔ گنہگاروں کو خرقہ پہناتے، ان سے توبہ کراتے، اپنے مریدوں میں قبول کرتے تھے اور خاص وعام، غریب ودولت مند، بادشاہ وفقیر، عالم وجاہل، شریف ورذیل، شہری ودیہاتی، نمازی ومجاہد، آزاد وغلام سب کو طاقیہ، توبہ اور پاکی کی تعلیم دیتے تھے۔[۴۲]

سلطان علاء الدین خلجی (۱۳۱۶۔۱۲۹۶ء) خواجہ نظام الدین اولیاء کے عقیدت مندوں میں تھا۔

جاگیر عطا کرنا چاہتا تھا لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ پھر قطب الدین مبارک شاہ (۲۰۔۱۳۱۶ء) نے سلطنت پر قبضہ کر لیا، تو دلی عہد خضر خان کا مربی و مرشد ہونے کی بنا پر خواجہ محبوب الٰہی کا دشمن ہو گیا جس کو اسی کے معتمد خاص خسرو خان بڑور نے قتل کر دیا، پھر غیاث الدین تغلق (۲۵۔۱۳۲۰ء) تخت دہلی پر متمکن ہوا۔ اس کے دل میں بھی خواجہ کی جانب سے خلش رہی، جو تا حیات قائم رہی۔۹۶ خواجہ کی غیر معمولی مقبولیت سے بعض صوفیہ اور علماء و فقہا بھی کدر کھتے تھے۔ انھوں نے سلطان کی خفگی کا فائدہ اٹھا کر محضر منعقد کی، جس میں مسئلہ سماع کو بنیاد بنایا۔ سلطان خود حکم بنا لیکن خواجہ محبوب الٰہی کی مقبولیت عام و خاص کی بنا پر خلاف فیصلہ صادر کرنے کی جرأت نہ کر سکا حالانکہ اس کے دل میں خواجہ محبوب الٰہی کی جانب کدتھی۔ خواجہ محبوب الٰہی کا جماعت خانہ ہو یا لنگر، ہر شخص کے لیے یکساں کھلا رہتا ہے۔ ہندو و مسلم کی تفریق نہیں تھی۔ خواجہ کے محبوب مریدین میں طوطی ہند امیر خسرو کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ خواجہ محبوب الٰہی کے خلفاء کی تعداد کثیر ہے، جن سے سلسلہ چشتیہ نظامیہ سراسر ہند میں پھیلا۔ ان میں شیخ محی الدین کاشانی، مولانا وجیہ الدین یوسف کلاکھیڑی، مولانا شمس الدین بن یحیٰی، شیخ قطب الدین منور ہانسوی، شیخ علاء الدین نیلی، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا برہان الدین غریب ہانسوی شیز زک بدر الدین مانک پوری، قاضی جلال الدین دولت آبادی، سید یوسف دولت آبادی اور شیخ اخی سراج الدین عثمان، جنھوں نے بنگال میں سلسلہ چشتیہ کی خانقاہ قائم کی۔ لیکن۔ خواجہ محبوب الٰہی کی خلافت رحمانی شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کو حاصل ہوئی۔

شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (م: ۷۵۷ھ/۱۳۵۵ء) کا لقب 'قطب ارشاد' بھی ہے۔ 'چراغ دہلی' کہلانے کا سبب یہ تھا کہ شیخ عبداللہ یافعی نے دوران طواف کعبہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے دریافت کیا تھا، ان دنوں دہلی میں کون بزرگ ہیں؟ انھوں نے جواب دیا، اس زمانہ میں شیخ نصیر الدین محمود سے دہلی کا چراغ روشن ہے۔ اسی دن سے 'چراغ دہلی' مشہور ہو گئے۔ شیخ نصیر الدین محمود کے جد شیخ عبداللطیف یزدی خراسان سے لاہور آئے تھے۔ والد شیخ یحیٰی اودھی سوفی منش بزرگ تھے۔ شیخ نصیر الدین محمود نے ۲۵ سال کی عمر علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۴۰ سال کی عمر میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے دامن عاطفت میں آئے، صدق ارادت سے وابستہ ہو گئے۔ سلطان فیروز شاہ کو ان سے خصوصی عقیدت تھی۔ اس نے ان کی زندگی میں ہی مقبرہ بنوا دیا تھا۔ اسی میں آسودہ ہیں۔ ان کے دور سے دہلی کی خانقاہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جس کو ہر دور میں کسی نہ کسی اہم صوفی کی سربراہی حاصل رہی ہے۔ ان میں خواجہ حسن نظامی (م: ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء) کو بیسویں صدی کے صوفیہ میں خصوصی شہرت حاصل ہوئی جو علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے۔ اردو کے صاحب طرز انشاپرداز تھے، متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں۔ ان کے صاحبزادے خلیفہ و جانشیں خواجہ حسن ثانی نظامی اپنے مرشد کے نقش قدم پر گامزن ہیں۔

بابا فرید کے دوسرے اہم خلیفہ، جن سے سلسلہ چشتیہ صابریہ جاری ہوا، شیخ مخدوم علاء الدین علی بن احمد صابر کلیری (م: ۶۷۰ھ/۱۲۷۱ء) ہیں۔ جو اپنے دور میں خدا رسیدہ بزرگ، صاحب کشف و کرامات اور زاہد و متقی کی حیثیت سے مقبول خاص و عام تھے۔ ان کا مزار رڑکی (اتر پردیش) میں مرجع عقیدت ہے۔ پہلے لوگ ان کے مزار سے واقف نہ تھے۔ عہد شاہ جہانی (۶۸۔۱۶۲۸ء) میں تحقیق کے بعد معلوم ہو سکا۔ شیخ مخدوم

صابری کلیری بابا فرید کے بھتیجے کہے جاتے ہیں۔ان کے خلافت نامہ کو شیخ جمال الدین نے چاک کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔۹۷ان کے سلسلہ کو شیخ احمد عبدالحق کی بدولت اہمیت حاصل ہوئی۔

خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (م: ۷۵۸ھ/۱۳۵۶ء) کے شاگردوں میں سید محمد بن جعفر المکی کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ان کے والد امیر جعفر المکی کو سلطان محمد بن تغلق کے دور (۵۱-۱۳۲۵ء) میں امیر کبیر اور مقطع کا عہدہ حاصل تھا۔سید حسینی نے غزنی، خراسان، فلسطین، دمشق، عراق، مکہ مدینہ، مصر اور مغربی ممالک کا دورہ کر کے ۳۸۰ نامور صوفیہ سے ملاقاتیں کی تھیں۔شیخ عبدالحق نے سید محمد بن جعفر المکی کا شمار خواجہ نصیر الدین محمود کا 'جلیل القدر خلفاء' 'منفرد اولیاء' عالی مقام توحید و تفرید' میں کیا ہے۔لیکن ان کی تصانیف میں جن عقائد کا اظہار کیا گیا ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانوں کی کثرت تعداد کی مانند راہ سلوک کی بھی کثیر تعداد ہے۔لیکن ان میں تین راہیں معتبر ہیں۔اولاً یہ کہ عام شریعت کی ظاہری پابندی کی جائے۔یہ عوام کی راہ ہے، جس میں منزل مقصود تک پہنچنا دشوار ہے۔ثانیاً یہ کہ تقویٰ و ریاضت اختیار کرنا۔یہ داخلیت کی راہ ہے، جو مقدس بزرگوں کے لیے مخصوص ہے۔ثالثاً یہ کہ لاہوت شناسی حاصل ہو جائے۔یہ عارف کامل کی منزل ہے۔اس تیسری منزل تک پہنچنے کی راہ میں نو منزلیں ہیں توبہ، زہد، توکل، قناعت، عزلت گزینی، ذکر الی اللہ، توجہ باللہ، مرتبہ اور راضی بالرضا سید حسینی کے نزدیک بایزید بسطامی یا حلاج نے خود نعرہ نہیں دیا تھا، بلکہ ان کے پردے میں خدا بول رہا تھا۔دمن دقو، کے رشتہ کی پہچان نہ ہونے کی بنا پر غلط فہمی ہوئی۔سید حسینی کلمہ پڑھ لینے کو اہمیت نہیں دیتے۔ان کے نزدیک تبدیل مذہب کے پانچ اسباب ہوتے ہیں۔موت کا خوف اہل خاندان کے غلام بنائے جانے کا خوف، مسلمانوں کی تبلیغ، انعام و اکرام کی لالچ، آبائی مذہب مین تعصب و تنگ نظر نو مسلم کلمہ پڑھ کر دنیا حاصل کر لیتا ہے، قرآن کا ارشاد ہے: اللہ ول الذین امنوا یخرجھم من الظلمت الی النور (اللہ صاحبان ایمان کا ولی ہے۔وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔) نام نہاد علمائے دین کی طرح اسلام کی تاویل نہیں کرنا چاہئے۔اسلام مذہبی اجارہ داری کے خلاف ہے۔

سلطان محمد تغلق نے ۷۲۸ھ/۱۳۲۷ء میں دولت آباد کو ہندوستان کا پایہ تخت بنایا تو صوفیہ بھی جبراً لائے گئے۔جن میں شیخ برہان الدین غریب، سید یوسف حسینی راجو قتال، میر حسن سجزی، سید زین العابدین وغیرہ شامل تھے۔ان میں اکثر صوفیہ لوٹ کر دوبارہ دہلی نہیں گئے اور خلد آباد میں ہی بس گئے۔ان میں معاصرین سید نصیر الدین کھڑک پھوڑا، پیر پالک، پیر میٹھے اور پیر جمنا کے نام مقامی ثقافتی اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔شیخ برہان الدین غریب کے خلفاء میں شاہ کو چک ولی دائم (م: ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء) اہم ہیں لیکن ان سے قبل سید یوسف راجو قتال (م: ۷۲۱/۱۳۳۱ء) کو دکن میں تصوف کے فروغ و ارتقا میں مرکزیت حاصل ہو چکی تھی۔ان کے اہل خاندان نے ارض دکن کو ارم طریقت بنا دیا۔سید یوسف سے ملتے جلتے کئی نام ملتے ہیں جن میں راجو قتال کا لاحقہ بھی شامل ہے۔لیکن یہاں ان سید یوسف حسینی راجو قتال کا ذکر مقصود ہے جو خواجہ بندہ نواز کے والد ماجد تھے۔بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انھیں مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا بھائی لکھ دیا تو ہمارے محققین کرام نے بلا زحمت تحقیق اسے دہرانا شروع کر دیا۔حالانکہ سید یوسف حسینی راجو قتال اور سید

صدرالدین راجن قتال دو مختلف شخصیت ہیں۔ سید یوسف حسینی کا شجرۂ نسب امام حسین تک اس طرح پہنچتا ہے:
سید یوسف بن علی بن محمد بن یوسف بن حسین بن محمد بن علی بن حمزہ بن داؤد بن زید بن ابوالحسن الجنیدی بن محمد بن عمر بن یحییٰ بن حسین ابوعبداللہ بن زید شہید بن زین العابدین بن سید الشہداء امام حسین۔ یعنی سید یوسف الحسینی قتال نسبی اعتبار سے زیدی ہیں۔ جبکہ مخدوم جہاں جہاں گشت نقوی ہیں۔ ان کا شجرۂ نسب اس طرح ہے:
سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشت بن احمد کبیر بن جلال سرخ پوش بن بخاری بن علی ابوالمؤید بن جعفر بن محمد بن محمود بن احمد بن عبداللہ بن علی اشقر بن جعفر زکی بن امام علی نقی بن امام محمد تقی بن امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن سید الشہداء امام حسین سید راجو قتال کے اجداد خراسان سے ہندوستان وارد ہوئے جبکہ جہاں نیاں جہاں گشت کے جد سید جلال سرخ بخارا سے ہندوستان تشریف لائے۔ سید جلال سرخ سلسلۂ سہروردیہ کے شیخ بہاء الدین زکریا کے مرید و خلیفہ تھے، جبکہ سید راجو قتال سلسلہ چشتیہ کے خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید اور شیخ چراغ دہلی کے خلیفہ تھے، سید جلال الدین سرخ پوش بخاری اوچہ (ملتان) میں فروکش تھے۔ سید راجو قلعہ دہلی میں ملازم تھے اور محمد تغلق متلون مزاج کا شکار ہوئے وغیرہ سید راجو قتال کی یادگار مشہور فارسی نظم وتحفۃ النصائح ہے جو انھوں نے اپنے فرزند خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز کی ہدایت و رہنمائی کے لیے لکھی تھی :

گویا ہمی یوسف گدا در وعظ سخنے چند را　　　　از بہتر خلف خوش لقا بوالفتح آں نور البصر

خواجہ سید محمد بن یوسف الحسینی معروف بہ بندہ نواز گیسو دراز (م: ۸۲۶ھ/۱۴۲۲ء) سلسلۂ چشتیہ کے مقبول ترین بزرگان طریقت میں ہیں، جن کے فیض روحانی سے اہل دکن میں فروغ دین ہوا۔ موصوف کو خواجہ نصیرالدین محمود چراغ دہلی سے خرقہ وخلافت رحمانی حاصل ہوئی۔ ان کے ہجرت دکن کا سبب بقول شیخ عبد الحق اپنے مرشد شیخ نصیرالدین کی وفات کے بعد دہلی سے دل اچاٹ ہونا تھا۔ ابوالفضل کے مطابق اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل تھی ۔ اور ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کے نزدیک حملہ تیمور کی خبریں تھیں، جن کی بناپر دہلی محفوظ جگہ نہیں رہ گئی تھی۔ موصوف پہلے گوالیار گئے، وہاں سے گجرات گئے، جس کی سلطنت کا بانی ظفر خان شیخ احمد کھٹو کا مرید تھا۔ اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ خواجہ بندہ نواز گجرات میں کئی برسوں تک رہے۔ وہاں سے دکن ہجرت کر گئے۔ یہ بہمنی سلطنت کا سنہرا دور تھا کہ سلطان تاج الدین فروز شاہ (۱۴۲۲-۱۳۹۷ھ) سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس نے اپنے اراکین سلطنت کے ہمراہ استقبال کیا۔ لیکن جب اس نے اپنے بھائی احمد خان کو نابینا کر کے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے کا منصوبہ بنایا اور بیٹے کے لیے خواجہ سے دعا کا خواستگار ہوا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر احمد خان نے خواجہ کے خانقاہ میں پناہ لی تو خواجہ اور سلطان کے درمیان کشیدگی عروج کو پہنچ گئی۔ احمد خان ۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء کو سلطان بنا تو خواجہ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ نئے سلطان نے خانقاہ کو فراخ دلی سے عطیات دیے۔

گلبرگہ (کرناٹک)، جہاں خواجہ گیسو دراز کا مزار ہے، اس دور میں سلطنت بہمنی کا دارالسلطنت تھا لیکن بعد میں (۱۴۳۶ء میں) حیدرآباد دارالسلطنت ہو گیا تو گلبرگہ کی ظاہری چمک دمک ختم ہو گئی لیکن باطنی روشنی وقت گذرنے کے ساتھ بڑھتی گئی ہے۔ دکن میں خواجہ بندہ نواز کی درگاہ کو درگاہ خواجہ اجمیری کی سی اہمیت

ہے۔خواجہ بندہ نوار اپنے تقویٰ وتقدس، کشف روحانی اور مقبول بارگاالٰہی ہونے کے علا
ں ممتاز ہیں۔ان سے متعدد تصانیف منسوب ہیں جن میں تفسیر قرآن مشرق الانوار (مجموع
قہ اکبر، ادب المریدین (رسالہ قشیری کا ترجمہ) عوارف المعارف، جوامع الکلام وغیرہ ف
العاشقین، تلاوت الوجود، ہدایت نامہ وغیرہ اردو میں یادگار چھوڑی ہیں۔ بعض محققین ا
انتے بلکہ بعد کے دور سے منسوب کرتے ہیں لیکن اس میں کسی کو کلام نہیں ہے کہ خواجہ
علوم کے علاوہ ہندوستانی کا علوم کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا تھا۔حالانکہ سلسلۂ چشتیہ میں ن
کا بول بالا رہا، انھوں نے تصور وحدت الشہود کو مساوی اہمیت عطا کی۔موصوف ابن ع
کے خلاف تھے کہ اس میں اولیاء کا اطلاق قرب الٰہی پر منحصر قرار دیا گیا ہے۔خواجہ گیسودراز
ں کو صوفیہ پر فضیلت حاصل ہے اور اور اصلاً وہی ولی اللہ ہیں۔ان کے خانوادۂ روحانی
ں کے فرزند وخلیفہ سید اکبر حسینی (م:۸۱۲ھ/۱۴۰۹)اور نواسے سید عبداللہ حسینی (م:۸۵۲
ں۔سید اکبر حسینی کو خواجہ بندہ نواز 'میاں بڑھ' کہتے تھے۔ان کا انتقال باپ کی زندگی میں ہو
زان کا عرس اسی اہتمام سے کرتے تھے، جس طرح مرید پیر کا عرس کرتے ہیں۔سید اکبر حسی
ی کے بیان میں کہتے تھے کہ اگر وہ میرے بیٹے نہ ہوتے، اس صورت میں یہ خدمت بجالا
یر سے نہیں بڑھا، سوال دو اشخاص کے: ایک، خواجہ بختیار کا کی جو خواجہ معین الدین چشتی
ے سید محمد اکبر مجھ سے۔سید اکبر حسینی نے خواجہ بندہ نواز کے دو سال کے ملفوظات 'جامع الکل
یں ترتیب دیے تھے، جو تصوف کی اساسی کتب میں شمار ہوتی ہے۔سید عبداللہ حسینی کا خواجہ
ان کرنے میں اختلاف ہے۔کوئی پوتا کسی نے نواسی کا شوہر لکھا ہے۔سید عبداللہ حسینی سے
ے رسالہ نشاط کا ترجمہ منسوب ہے، جو ناپید ہے۔

دکن میں خود مختار بہمنی سلطنت قائم ہوئی تو اہل علم و عرفت کے پہلو بہ پہلو اہل طریقت
ی۔سلطان حسین بہمن (۵۹_۱۳۴۷) کا پایہ تخت گلبرگہ تھا، جو احسن آباد یا حسین آباد کہا
مت میں شیخ عین الدین گنج العلم (م:۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء) ہوتے ہوئے دکن تشریف لا
ش ہوئی۔وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔دہلی سے گجرات ہوتے ہوئے دولت آباد گئے
دین حسینی سے بیعت کی۔وہاں سے عین آباد ساگر اور آخر میں بیجا پور گئے، جہاں وفات
ں تصنیف کیں جن میں تکملۂ عطقات ناصری اور صوفیہ کے احوال پر مبنی اطوار الابرار قا
ی محمد شاہ ثانی (۹۸_۱۳۷۸ء) کے دور میں مولانا فضل اللہ انجو اور شیخ سراج جنیدی گلبرگ
ں خواجہ بندہ نواز گلبرگہ تشریف لائے۔خواجہ ابرار الدین محمود کاواں (م:۱۴۸۱ء) وکیل سلطن
لی صفات انسانی یکجا تھے۔جس کے حسن تدبر سے سلطنت بہمنی کا وقار قائم رہا۔اس نے
لیے مدرسہ قائم کیا۔صوفیہ کا بڑا قدرداں تھے۔جن میں شاہ ظاہر استرآبادی اور ملاظہی نظیری ک

شاہ میرن جی شمس العشاق (م:۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء) دکنی تاریخ تصوف میں خصوصی اہم

ہیں۔ان کے نسب وسوانح میں محققین کے درمیان شدید اختلافات ہیں۔ان کی بوتنت کے اعتبار سے ان کے والد کا نام حاجی دولت مکی تھا،جن کی سکونت مکہ معظمہ میں تھی۔ والدہ ہندوستانی چغتائی تھیں،میران جی کی ولادت مکہ معظمہ میں ہوئی۔امیرالدین نام میران جی عرفیت۔بائیس سال کی عمر میں مکہ سے مدینہ گئے۔بارہ سال تین مہینے پانچ دن ایک کروٹ سے لیٹے رہے۔خواب میں رسالت مآب کی زیارت ہوئی۔ہدایت نبوی ہوئی کہ ہندوستان جاؤ۔انھوں نے کہا میں وہاں کی زبان نہیں جانتا۔حکم ہوا شاہ کمال الدین بیابان سے ملاقات کرو۔میران جی ہندوستان آئے،شاہ کمال الدین بیابانی (م:۸۸۱ھ/۱۴۷۲ء) سے بیعت کی۔اور دکن میں ہی رہ گئے۔ان سے کئی تصانیف منسوب ہیں مثلاً شرح رعوب القلوب،سبع صفات،حل ترنگ اور گل باش وغیرہ لیکن محققین ان کی تصانیف قرار دینے میں تامل کرتے ہیں۔البتہ ان کا مرتبہ ماہے کوں شوال ہے یادگار ہے۔میران جی کے بیٹے اور خلیفہ شاہ برہان الدین جانم (م:۱۰۰۷ھ/ ۱۶۵۹ء) صاحب تصانیف صوفی تھے۔ان کی متعدد کتابوں میں کلمۃ الحقائق اور ارشاد نامہ زیادہ اہم ہیں جانم نے بن عربی کے وحدت الوجود شیخ شہاب الدین سہوردی کے تصور حقیقت نور کے درمیان تطابق پیدا کیا۔ابن عربی کے نزدیک ذات باری چھ تنزلات سے گذر کر عالم ممکنات میں ظہور کرتی ہے۔شیخ الاشراق اپنے تصور حقیقت نور میں نورالسمٰوات والرض (اللہ آسمان اور زمین کا تعرنور ہے۔النور۲۴/ ۳۵) کے چھ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ان کی تفصیلات اپنی جگہ بیان کی جاچکی ہیں لیکن یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ جانم نے نور کے تنزلات اور وجود کے مراتب کی بحث میں من ناسوت کے چار عناصر یعنی آب ،آتش خاک اور ہوا۔ پر زور دیا ہے۔ ان کے فرزند اور خلیفہ سید امینالدین اعلیٰ نے تطابق وجود ونور کو مزید تناظر عطا کیے۔

سید امین الدین اعلیٰ (م:۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء) کی ولادت جانم کی وفات کے بعد ہوئی تھی لہٰذا ان کے سایہ عاطفت سے محروم رہے۔تعلیم وتربیت چچا امین الدین نے کی اور خاندانی خرقہ خلافت شیخ عطاءاللہ حسینی سے پہنا۔ان کی تعلیمات سے اہل دکن کو خصوصی طور پر عرفان وآگہی حاصل ہوئی۔ان کے لاتعداد القاب مقبولیت کی دلیل ہیں۔ان کی مریدین تعداد ایک لاکھ بتائی جاتی ہے جن میں بزرگ شخصیتیں شامل ہیں۔مثلاً بابا شاہ حسینی شاہ فتاح،شاہ قائم،شاہ نور محمد دریا،وغیرہ ان کے نثری کارناموں میں رسالہ گنج مخفی وجوریہ،شرح کلمہ طیب،حکمۃ الاسرار۔گنج لکی نولطو دا ہلیہ ارشاد نامہ ایک ہی رسالہ کے تین نما ہیں۔اس میں نظام تصوف کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔رسالہ وجودیہ میں وجود کے چھ مراتب: موکل،روح،قلب،توحید ذکر اور منزل شہادت کی وضاحت کی گئی ہے۔اعلیٰ نے عناصر ترکیبی میں وخالی کو شامل کرکے ان کی تداد پانچ کردی۔قدیم ہندوستانی تصور میں عناصر ترکیبی مذکورہ بالا چار عناصر کے علاوہ پانچواں عنصر آکاش ہے،جن کو پنچ مہا بھوت کہتے ہیں۔'پنچ' سے متعلق متعدد تصورات ہیں مثلاً 'پنچ گویہ' 'پنچ تب' 'پنچ پلو' وغیرہ' اودتیہ' سے متعلق مادھوآچار کا 'گرنتھ پنچ دشی' ہے۔اس سے اعلیٰ کے ماخذ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اعلیٰ نے پانچ عناصر کے پانچ 'گن' بھی متعین کیے۔اس بنا پر ان کے تصور عرفانیت کو پچیس گنواں کا تصوت بھی کہتے ہیں۔۱۶ویں صدی (دکرمی) کے مشہور رادوتیوزادی آچاریہ نرسنگھا شرم سوامی ادے بھٹ نے بھی عرفانیت کے پنچ گنوں کا ذکر کیا ہے۔اعلیٰ کی عرفانی اصطلاحات بھی سنسکرت تباد ہیں مثلاً

آکاز (ناسوت) اونکار (ملکوت) بودھ (عالم) ترکئی (سرنہتی) بھرم (وہم) اروپ (تنزل)، آتما (روح) دستاپن (مشہود) وغیرہ۔ اعلیٰ پر اکثر جذب و سرمستی طاری رہتی تھی۔ استغراق سے افاقہ ہوتا تو معتقدین سے ملاقات کرتے۔ معاصر صوفی میران جی خدانما نے ملاقات کی۔ اعلیٰ انھیں اپنے حجرے میں لے گئے۔ باہر آئے تو کہا امین الدین میران بنو گیا۔ میران امین الدین بن گیا۔ ایہ تصور ہندوستانی شریعت کا تصور ماہیت قلب (☆☆) ہے۔ سجدۂ بندگی اور سجدۂ تحسیت کے درمیان فرق بنیا کر کے اعلیٰ سجدۂ تعظیمی کو جائز قرار دیتے تھے۔

بیابانی صوفیہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سندھ میں آبادی سے دور جنگلوں میں رہنے کی بنا پر بیابانی کہلائے۔ انھیں میں شاہ کمال الدین بیابانی شمس العشاق کے مرید تھے۔ شاہ اشرف بیابانی (م:۹۰۳۵ھ/۱۵۲۹ء) کے وادل قادر آباد جالنہ میں رہتے تھے جو دولت آباد کی بنا پر رشد و ہدایت کا مرکز بن گیا تھا۔ سید ضیاء الدین بیابانی (م:۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء) نے حسن کردار سے متاثر ہو کر سلطان مشکل آسان نے ان سے اپنی بہن کا عقد کر دیا اور چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، رفاعیہ اور نقش بندیہ کی خلافتیں عطا کر دیں۔ سید اشرف بیابانی نے اپنے والد سے علم و آگہی رموز طریقت اور خلافت رحمانی حاصل کی۔ ان کی وفات کے بعد جانشین ہوئے۔ شاہ اشرف کی شہرت کا مدار نوسرار ہے، جو اردو میں ولین مرثیہ ہے۔ لازم المعتدی بھی ہے، جو ایک طرح کی فرہنگ ہے۔ دکن کے دیگر اہم صوفیہ میں شیخ قطب الدین قادری (م:۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء) خواجہ محمد دہدار (م:۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء)، میرانجی خدانما (م:۱۰۷۴ھ/۱۶۶۲ء) میران یعقوب (م:۱۰۷۸/۱۶۶۷ء) وغیرہ شامل ہیں۔

بنگال اور بہار کا فاتح محمد بختیار خلجی تھا، جس نے رائے لکشمن رائے یا رائے لکشمی کو قتل کر کے ۵۔۱۲۰۴ھ میں اس کے دارالسلطنت نادیا پر قبضہ کیا۔ منہاج سراج نے اس واقعہ کو داستانوں کی طرح دلچسپ بنا کر پیش کیا ہے۔ لیکن بختیار خلجی نے اپنا پایہ تخت لکھنوتی (لکشمن وتی) کو بنایا، جہاں مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں آباد کیں اور لکھنوتی کو مشرقی ہند کے اسلامی مذہبی و ثقافتی مرکز کی حیثیت سے ترقی دی۔ ان مدرسوں اور خانقاہوں سے وابستہ علماء و صوفیہ کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ شیخ اخی سراج الدین عثمان (نیم تعلیم یافتہ درویش) نے لکھنوتی میں سلسلہ نظامیہ چشتیہ کی بنیاد ڈالی تھی، حالانکہ اس سے قبل شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ شرف الدین ابوتو آنا نے سنارگاؤں (مشرقی بنگال) اور پنڈوا (بنگلا دیش) میں سلسلہ چشتیہ کی بنیاد قائم کر دی تھی۔ شیخ اخی کے برعکس ان کے خلیفہ شیخ علاؤ الحق بن اسعد لاہوری (م: ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء) بڑے عالم و فاضل تھے۔ ان کے فرزند و خلیفہ شیخ نور الحق معروف بہ شیخ نور قطب عالم (م: ۸۱۳ھ/۱۶ یا ۱۹یا ۱۴۱۰ء) سے خانقاہ پنڈوا کو خصوصی شہرت ہوئی۔ ان کی خانقاہیں پورے بنگال اور بہار میں پھیلی ہوئی ہیں، جن میں پورنیہ کو شیخ حسین دھکڑ پوش کی خانقاہ کو امتیاز حاصل ہے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے بنگال کو عالم اسلام کے اہم صوفی مراکز میں شمار کیا ہے۔

میر سید اشرف جہان گیر سمنانی (م: ۸۰۸/ ۱۴۰۵ء) ۷ کی بدولت مشرقی اتر پردیش میں تحریک تصوف کو خصوصی تقویت حاصل ہوئی۔ موصوف کو سلاسل چشتیہ و سہروردیہ میں یکساں عظمت و اہمیت حاصل ہے۔ ان کے والد محمد ابراہیم سمنان کے سلطان تھے۔ ان کی وفات کے بعد سمنان کی عنانِ حکومت

سنبھالی۔ لیکن ان کی طبیعت راہِ سلوک پر مائل تھی۔ ترک سلطنت کیا۔ سب کو وداع کر کے ماوراالنہر، بخارا، سمرقند ہوتے ہوئے ۱۳۸ء میں اوچہ تشریف لائے۔ ہندوستان کے مختلف اکابر صوفیہ کے مزارات کی زیارات کے بعد مزید زیارات کے لیے مدینہ منورہ، نجف اشرف، کربلائے معلیٰ گئے پھر روم، شام، دمشق، مشہد مقدس ہوکر ہرات گئے۔ ایران، عراق، دمشق، ترکی، عرب وغیرہ سفر کرتے رہے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھوں نے دورانِ سفر ایک سو نوے اولیاء سے فیوض و برکات حاصل کیے تھے۔ علاء الدولہ سمنانی سے دوستانہ مراسم تھے لیکن ان کے تصور وحدت الشہود سے متاثر نہ ہوئے۔ ماوراالنہر میں خواجہ بہاء الدین نقش بند سے ملاقات کی لیکن ان کا مسلک بھی متوجہ نہ کر سکا۔ اوچہ میں تھوڑے عرصہ تک شیخ مخدوم جہانیان جہاں گشت کے ہمراہ قیام کیا۔ پھر خواجہ بندہ نواز سے ملاقات کی، ان سے اور ان کے شاگردوں سے تصور وحدت الشہود پر مباحثہ کیا، پھر ۵ شوال ۷۸۲ھ/۲ جنوری ۱۳۸۱ء کو منیر (بہار) پہنچے، جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی لاش تدفین کی منتظر تھی۔ نماز جنازہ پڑھائی اور بنگال کے لیے روانہ ہوگئے۔ پنڈوا اور سنارگاؤں ہوکر جون پور واپس ہوئے، لیکن وہاں بھی قیام نہیں کیا بلکہ مشرقی اتر پردیش میں فیض آباد کے ایک گاؤں کچھوچھہ کو اپنا مستقر قرار دیا۔ رودلی (سیتاپور) میں شیخ کریم الدین دانشمند سے ملاقات کی۔ سید سمنانی نے ابن عربی کے تصور وحدت الوجود کی زبردست موئیدین میں تھے۔ لیکن ابن عربی کے عقیدہ اطاعت اور تصور فرعون اولیٰ مصری کے متعلق دلائل کی تائید نہیں کرتے تھے۔ ابن عربی نے فصوص الحکم میں اس مسئلہ کے تعلق سے دس مختلف مقامات پر بحث کی ہے۔ ابن عربی کے نزدیک فرعون کو جنت و دوزخ کی فکر نہیں تھی، بلکہ وہ مشیت الٰہی کا پابند تھا۔ اس لیے آزاد مطلق نہیں تھا اور اس کی عدول حکمی نہ تو خالص مذہبی تھی، نہ غیر مذہبی۔ اس لیے اس کو بدعقیدہ قرار دینا غیر صحیح ہے۔ لطائف اشرفی میں ایک واقعہ درج ہے کہ سید اشرف جہاں گیر نے ایک کتاب حضرت علی کی فضیلتوں پر مبنی لکھی تھی جس میں انھیں تمام صحابۂ کرام سے افضل ثابت کیا گیا تھا۔ اس پر علمائے اہل تسنن نے محضر کیا اور ان پر رفض کا الزام وارد کیا۔ لیکن انھیں میں سے مولانا سید خان نے یہ کہ کر معاملہ رفع دفع کر دیا کہ موصوف سید ہیں۔ اگر انھوں نے اپنے جد کے لیے چند اچھے کلمات لکھ دئے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

کم و بیش اسی زمانہ میں چشتیہ صوفیہ کے دیگر مراکز بھی قائم ہوئے، جن میں چند اہم مراکز کا ذکر ہی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً لکھنؤ سے تقریباً ۱۰۰ کم کے فاصلہ پر رودولی (ضلع سیتاپور) میں شیخ احمد عبدالحق شاگرد شیخ جلال پانی پتی، جو سلسلہ چشتیہ صابریہ کے صوفی تھے، شاہ مینا کے شاگرد شیخ سعد الدین (م۔۸۵۱۵ء) خیرآباد (ضلع سیتاپور)، خود شاہ مینا جن کا مزار لکھنؤ میں ہے۔ شیخ نظام الدین اولیا کے شاگرد مولانا محمد اسماعیل بن مولانا جلال الدین نمانک پور (ضلع پرتاپ گڑھ)، کڑا میں شاہ حسام الدین معروف بہ شاہ حسام الحق (م۔ ۱۴۱۱ء) الہ آباد ضلع کے جھونسی کے نزد قصبہ اتراؤں (الہ آباد) میں دلگڈھ کے شاہ باسط علی قلندر رونی کے قاضی خطیر الدین، ان کے بھائی قاضی معز الدین ظفر آباد ضلع جون پور، انھیں کے خاندان کے خواجہ اسماعیل چشتی کنت ضلع مرزاپور، شہر الہ آباد میں صوفیہ کے بارہ دائرے، خصوصاً دائرہ شاہ محب اللہ، دائرہ شاہ حجت اللہ، دائرہ شاہ اجمل، دائرہ شاہ علیم اللہ، دائرہ شاہ رفیع الزماں، دائرہ شاہ نور علی، دائرہ شاہ رضی الدین وغیرہ۔ منڈو

(مالوہ) کے خواجہ معین الدین خورد جو خواجہ اجمیری کے خاندان سے تھے۔ خانقاہ رشیدیہ جون پور (یوپی) کے، خانقاہ علیمیہ غازی پور (یوپی) کے اور گورکھپور کے صوفیان سبز پوش میں سید قیام الدین شاہ (م۔۱۷۱۶ء) اور سید شاہد شاہ فانی سبز پوش (م۔۱۹۵۲ء) وغیرہ وغیرہ

اوپر کی سطروں میں ذکر آچکا ہے کہ سلسلہ سہروردیہ کے موسس شیخ شہاب الدین ہیں۔ لیکن ان کے خلیفہ سلسلہ سہروردیہ کے متوازی سلسلہ کبرویہ قائم ہے، جس کے بانی شیخ ابوالجناب احمد بن عمر الخواتی معروف بہ شیخ ولی تراش ہیں، جو شیخ شہاب الدین سہروردی زنجانی (م۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) کی طرح شیخ زہادالدین ابوالنجیب سہروردی (م۔۱۱۶۸ء) کے شاگرد تھے۔ شیخ ولی تراش سے سلسلہ کبرویہ قائم ہوا اور عالم اسلام میں پھیل گیا۔ اس کی تین مختلف شاخیں ہیں بغدادی شاخ، خراسانی شاخ، جس کی دو ضمنی شاخیں رکنیہ اور اخشائیہ ہیں۔ تیسری ہندوستانی شاخ ہے جس کی دو ضمنی شاخیں ہیں ایک شاخ میر سید علی ہمدانی شاگرد شیخ شرف الدین محمود کی نسبت سے سلسلہ ہمدانی اور دوسری شاخ خواجہ رکن الدین فردوسی شاگرد خواجہ بدر الدین سمرقندی کی رعایت سے سلسلہ فردوسیہ کہلاتی ہے۔

سلسلہ کبرویہ کے ممتاز صوفی بزرگ امیر کبیر سید علی ہمدانی (م:۷۸۶ھ/۱۳۸۵ء) کے سلسلہ ہمدانیہ کا ایک اہم مرکز وادی کشمیر ہے، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ کشمیر میں تصوف کا آغاز سید علی ہمدانی سے ہوا۔ ان سے بہت پہلے راجہ ہرش (۱۱۱۱۔۔۱۰۸۹ء) کے دور میں بہت سے مسلمان کشمیر میں آباد ہو چکے تھے اور ایک صوفی بزرگ سید شرف الدین معروف بہ بلبل شاہ (م:۷۲۸ھ/۱۳۲۷ء) کی ۸ خانقاہ بھی قائم ہو چکی تھیں جو سلسلہ سہروردیہ سے متعلق تھے۔ جب منگول حملہ آور رنچن (م:۷۲۴ھ/۱۳۲۳ء) بلبل شاہ کے ذریعہ مشرف بہ اسلام ہوا اور اسلامی نام صدرالدین اختیار کیا، تو بلبل شاہ کی خانقاہ کو زبردست عطیات دیئے، لیکن ان کے خلفاء میں کوئی صوفی ایسا نہ ہوا، جو اس کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھال سکتا لیکن سلطان زین العابدین (۷۰۔۱۴۲۰ء) کے زمانہ میں سہروردیہ سلسلہ نے ایک بار سنبھالا لیا، جب شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے شاگرد سید احمد کرمانی وارد کشمیر ہوئے، حالانکہ وہ صرف چھ ماہ کے قیام کے بعد وطن مالوف لوٹ گئے لیکن اپنے ایک کشمیری شاگرد شیخ حمزہ کو اپنا جانشین بنا گئے۔

امیر کبیر سید علی ہمدانی نے علم طریقت شیخ تقی الدین علی دوسی سے حاصل کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد شیخ شرف الدین محمود نظام الدین مرزقانی نے سلسلہ کبرویہ میں داخل کیا، جو شیخ علاؤالدولہ سمنانی کے شاگرد تھے۔ شیخ علاؤالدولہ کا ذکر وحدت الشہود کے بانی کی حیثیت سے کیا جاچکا ہے۔ شیخ علاؤالدولہ کی خانقاہ میں ہی سید علی ہمدانی اور سید اشرف جہانگیر سمنانی کی باہمی ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں ہندوستان آئے لیکن سید اشرف سمنانی پہلے آئے اور سید علی ہمدانی کافی عرصہ سے بعد۔ پہلے انھوں نے اپنے نمائندوں کو ہندوستان بھیجا، جو سلطان شہاب الدین (س۔۱۳۵۴ء) سے خانقاہ کی زمین اور دیگر مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے شہاب الدین پورہ میں خانقاہ و لنگر قائم کر کے سید علی ہمدانی کو اطلاع کی تو موصوف تشریف لائے۔ راستہ میں اوچ کی خانقاہ میں بھی حاضری دی لیکن شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے ان کا تمسخر کیا کہ ہمدانی وہی شخص ہو سکتا ہے، جو علم ظاہر و باطن سے واقف ہو! سید علی ہمدانی پر یہ کلمات بار ہو گئے۔

انھوں نے جواب میں ہمدانیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ تین سال تک سری نگر میں قیام کے بعد وطن کی واپسی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تصانیف میں ذخیرۃ المسلوک کو شہرت ملی۔ ان کی کتاب رسالۃ فتوۃ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف صوفیہ کی تحریک فتوت سے بھی متعلق تھے۔ ان کی مشہور کتاب مودۃ القربیان کے شیعی عقائد کی دلیل ہے۔ اس میں انھوں نے متعدد ایسی احادیث درج کی ہیں، جن سے فقط اہلِ تشیع کا ناجی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسی زمانہ میں (غالباً ۱۳۹۰ء) ایک اور ممتاز صوفی سید حصاری، جو سلسلہ کبرویہ سے متعلق تھے، سری نگر وارد ہوئے۔ سلطان سکندر (۱۳۸۹۔۱۴۱۴ء) ان کا بیحد معتقد تھا۔ انھوں نے اپنی بقیہ زندگی سری نگر میں گذاری۔ سید علی ہمدانی کے صاحبزادے میر محمود بھی سری نگر آئے۔ ان سے متاثر ہوکر سلطان سکندر کا امیر خاص سابحث مسلمان ہوگیا اور سیف الدین نام اختیار کیا، خود سلطان سکندر بھی مرید ہوگیا۔ میر محمود کے اثرات بڑھے تو سید حصاری سے تصادم شروع ہوا، آخر کار میر محمود کو اپنے والد سید علی ہمدانی کی طرح کشمیر چھوڑنا پڑا۔ لیکن ایرانیوں کی اکثریت کشمیر میں رک گئی، جنھوں نے اپنی دست کاریوں سے کشمیری معیشت کو گلزار بنادیا۔ ان میں بیہقی سادات بھی تھے، جنھوں نے شاہی خاندان سے روابط قائم کیے۔ سلطان زین العابدین (۷۰۔۱۴۲۰ء) ان کا بڑا سرپرست تھا۔ انھوں نے میر محمود کی مذہبی سخت گیری کے خلاف ہندوؤں سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ اس نے سلطان زین العابدین کی مقبولیت میں زیردست اضافہ کیا کہ کشمیری اسے بڑا شاہ، (بڑا بادشاہ) کہتے ہیں۔

کشمیر میں سلسلۂ نوربخشی سے متعلق اتنی غلط سلط روائتیں رائج ہیں کہ صحیح نتائج تک پہنچنا دشوار ہوجاتا ہے۔ ان کا بنیادی سبب یہ ہے کہ دو مختلف شخصیتوں کو ناموں کی مماثلت کی بنا پر ایک سمجھ لیا گیا، حالانکہ ان کے درمیان تین سو برسوں کا فاصلہ ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق صحیح صورت حال یہ ہے کہ موسس سلسلہ سید صلاح الدین محمد نوربخش (م:۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء) کے والد سید عبدالمومن (م:۵۵۰ھ/۱۱۵۵ء) خلفاے فاطمین کی جانب سے عامل مراکو تھے۔ ان کا خاندان خوند میں آباد ہوا جو قزوین اور جیلان کے سرحدوں کے مضافات میں ہے۔ خوند مرکز رشد وہدایت بنا اور اسی خاندان کے ملا سید طاہر نے دکن میں آکر خصوصی اہمیت حاصل کی۔ سید صلاح الدین محمد نوربخش اور ان کے چچیرے بھائی قاسم انوار کو طریقت سے خصوصی دلچسپی تھی۔ تاریخ گلزار شمس کے الفاظ میں ''(سید صلاح الدین) علوم ظاہری و باطنی میں یکتاے زمانہ ہوا اور فاضل جلیل القدر تھا۔ انھوں نے کتاب فقہ الاحوط تصنیف فرمائی اور تمام فرقۂ اسماعیلیہ کے پیشوا اور امام ہو۔ انھوں نے اوائل دولت اسماعیلیہ میں لباس درویشانہ زیب تن فرمایا اور مذہب اثنا عشری نوربخشی کو تقویت دی۔ یہ صاحب کامل اکمل اور صاحب دل تھے۔ انھوں نے اپنے جد امجد کے طریقہ کو پردۂ تصوف میں رواج دیا ہے۔ ان کے فرزندوں سے یکے بعد دیگرے مذہب اثنا عشرہ کی کوشش کرتے تھے۔'' ''موصوف اور ان کے صاحبزادے میر شمس الدین قاسم انوار (م: ۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء) اپنے مسلک طریقت کی ترویج میں مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے کشمیر وارد ہوئے۔'' ''تمام کوستان میں تبت کشمیر گلگت یارقند اسکردو وغیرہ کو رائج کرکے ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء) میں اپنے وطن سبزوار واپس ہوگئے۔'' میر شمس الدین مولانا روم کے درمیان گہری دوستی تھی۔ انھوں نے مختلف مقامات کی سیر وسیاحت کی اور اپنے مشن کو پھیلایا۔ ہر جگہ الگ الگ ناموں سے

مشہور ہوئے پہلے سید شمس الدین عریضی اسماعیلی کہے جاتے تھے۔ وطن مالوف میں شمس الدین تبریزی، سبزوار میں شمس الدین سبزوداری، کشمیر میں پر شمس الدین عراقی، ترکستان میں شمس پرندہ شام و مصر میں شمس مغربی اور قاسم انوار، شاعروں میں شمس تبریز۔ ان کا مزار ملتان میں ہے۔

مذکورہ بالا دونوں بزرگ صوفیہ کی ساتویں پشت میں سید محمد نور بخش ثانی پیر متھ (۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء) اوران کے فرزند سید شمس الدین (م:۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) اپنے جد کی پیروی میں اسی طرح اپنے جد کی کتاب فقہ ا لاحوط نے کر کشمیر میں تشریف لے گئے اور ''مردم کشمیر و تبت و اسکردو و گلگت دیدخشاں میں ائمہ اثناعشر کے نام کا خطبہ سکہ جاری کیا اور مذہب نور بخشی نے زیادہ فروغ پایا'' لیکن اس بار انھوں نے اپنی آمد کی نوعیت مختلف رکھی۔ تیموری سلطان حسین مرزا (۱۴۶۹-۱۵۰۶) کے سفیر کی حیثیت سے ۱۴۸۱ء میں سری نگر وارد ہوئے۔ لیکن منصب سفارت سے زیادہ اپنے مذہب و مسلک کی ترویج واشاعت کے خواہان تھے۔ وہ سفیر کی حیثیت سے امور سلطنت میں دخل اندازی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر حصول مقصد کے لیے مقامی تائید کی بھی ضرورت تھی، اس لیے سلسلہ کبرویہ کے شیخ اسمٰعیل کے مرید ہو گئے اور ایرانی صوفی نور بخش کی حیثیت سے عوامی مقبولیت کے حقدار ہو گئے۔ سلطان حسین مرزا کے طلبی پر واپس ہوئے لیکن ۱۵۰۱ء میں دوبارہ سری نگر لوٹ آئے اور اپنے عقائد کی ترویج واشاعت کے لیے ایک خانقاہ قائم کی۔ موسیٰ رینا ایک سرکاری اہل کار متاثر ہو کر ان کے مسلک میں شامل ہو گیا، جس سے ان کو بڑی کامیابی ملی، لیکن وزیر سلطنت سید محمد بیہقی کی مخالفت سے زندگی اجیرن بن گئی تو مجبوراً الداخ میں سکردو چلے گئے، جہاں بدھوں کی کثیر تعداد کو شیعی عقائد میں داخل کیا۔ لیکن ۱۵۰۵ء میں سلطان فتح شاہ (۱۵۰۵-۱۴) نے موسیٰ رینا کو وزیر مقرر کیا، تو اس نے جارحانہ طور پر شیعت کی تبلیغ کی اور کثیر تعداد میں لوگ شیعی عقائد میں داخل کیے گئے۔ سلطان محمد شاہ، تیسری بار (۱۵۱۶-۲۸ء) حکمراں ہوا تو اس کا وزیر قاضی چک میر عراقی کا ہم نوا تھا۔ اس کے زیر اثر چک قبیلہ شیعہ ہو گیا، پھر جب چک سلطنت قائم ہوئی تو شیعیت کو مزید مواقع حاصل ہوئے۔ کشمیر کے علاوہ برصغیر کے دیگر علاقوں میں بھی سلسلۂ نور بخشی کے مختلف مراکز قائم ہوئے، جہاں ان کے مختلف مزارات ہیں اور بعض مقامات پر خانقاہیں ہنوز سرگرم ہیں۔ مثلاً ملتان، لاہور، اوچہ، نگری، ٹھٹھہ، ہوشیار پور، کراچی، سکر، ممبئی، احمد آباد، ک بڑودہ، کچھ، جے پور، حیدر آباد، کڑا وغیرہ۔

کشمیر میں صوفیہ کا ذکر سلسلہ ریشیان کے بیان کے بغیر مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سلسلۂ اویسی کے صوفیہ تھے۔ اسلام لانے سے قبل کی ان کی زندگی میں بودھیت کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کشمیر میں بودھیت اشوک اعظم (۲۳۱-۲۷ ق م) سے قبل داخل ہو چکی تھی۔ جس میں ریشیت کو روحانی درجہ حاصل تھا۔ ترک دنیا اور ترک لذت کر کے رہبانی و خانقاہی زندگی کو اساسی اہمیت حاصل تھی۔ ریشیت اور بدھ مت کے درمیان متعدد مماثلتیں ہیں۔ کشمیر میں ریشیت کے سرخیل شیخ العالم نور الدین نورانی (م: ۸۲۰ھ/ ۱۴۱۷ء) ہیں۔ ان کے والدین راجگان کشتواڑ میں تھے جو مہاراجہ بکرماجیت کی نسل سے تھے۔ ان ریشیوں نے مختلف اثرات کے تحت دعوت اسلام پر لبیک کہا تو اپنے نام تبدیل کر دیے اور اپنی عبادت و ریاضت اسلامی شریعت کا مطابق انجام دینے لگے لیکن عوام میں اپنے پرانے ناموں یا ریشی کی نسبت مشہور

ہیں۔ان عارفوں میں للہ عارفہ (لل دید، جس کے متعلق خیال ہے کہ اسلام قبول نہیں کیا لیکن سید علی ہمدانی سے ملاقات کی تھی) شیخ العالم نور الدین نورانی (نندہ ریشی یا سنہرا نند) بابا بام الدین (بم ساد) بابا زین الدین (جے یا زیا سنگھ) بابا لطف الدین (لدی) بابا نصر الدین (اوتر)۔وغیرہ شیخ العالم ریشیت کا سلسلہ پیغمبر اسلام سے قائم کرتے ہیں۔زبان کشمیری میں ان کے اشعار ملاحظہ ہوں:۵۸

اَوّل رِیشی احمدؐ ریشی، دویم اویس قرنی آو (پہلے ریشی احمد مجتبیٰ ہیں اور دوسرے ریشی اویس قرنی ہیں)
ترِیم رِیشی زَلک رِیشی، ژوریم حضرت پلاس آو (تیسرے ریشی زلکا ریشی اور چوتھے حضرت بلاس ہیں)
پُونژیم رِیشی رُمے رِیشی، شیئم حضرت میراں آو (پانچویں ریشی رمہ ریشی اور چھٹے حضرت میراں سید علی ہمدانی)
ستم کرکرمُ دِش ناہشی ہبہ سے کہنہ مےَ کیاناو (ساتواں رشی بقوے میں ہوں مگر میرا رتبہ اتنا بلند نہیں ہے)

شیخ العالم کے چار خلفاء ہوئے۔یہ چاروں دعوت اسلام قبول کرنے سے قبل بھی اپنی اپنی ریشیت میں ممتاز تھے۔ان کے نام ہیں بابا بام الدین، بابا زین الدین، بابا نصر الدین اور بابا لطیف الدین۔ان کے علاوہ کئی ریشیوں نے بطور خاص شیخ العالم کی روحانی تربیت سے امتیاز حاصل کیا۔ان میں سنگرام گنائی، سنگرام ڈار، بابا تاج الدین، بابا غلام الدین، بابا قطب الدین، بابا قیام الدین، مولانا مانک نایک، سوزن ریشی، خاطی ریشی، پچھم ریشی اول، پچھم ریشی ثانی، روپہ ریشی، سدہ ریشی بابا نیروز ریشی، گلاب ریشی وغیرہ کا خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔کشمیری سلسلۂ ریشیان کی ایک اور انفرادی خصوصیت ہے کہ شیخ العالم کے خلفاء میں خواتین بھی شامل ہیں۔ان میں شنگہ بی بی، شام بی بی، بہت بی بی، وَہست بی بی، دتہ بی بی، سلابی بی بی وغیرہ شنگہ بی بی ابتدائی زندگی میں کافی ادا خیز قتالہ مست شباب ورقاصہ تھیں، جنھوں نے سوزن رشی کے جامہ تقویٰ کو تار تار کردیا تھا لیکن شیخ العالم سے متاثر ہوکر تائب ہوگئیں۔

ہندوستانی سلسلہ کبرویہ کی ایک اور شاخ فردوسیہ کے موسس خواجہ رکن الدین فردوسی ہیں، جو خواجہ بدر الدین سمرقندی کے شاگرد و خلیفہ تھے۔خواجہ بدر الدین کا دہلی میں مستقل قیام تھا۔چشتیہ صوفیوں سے خوش گوار مراسم تھے۔شیخ نظام الدین اولیا اور خواجہ بدر الدین ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے اکثر ایک دوسرے کی خانقاہ میں جاتے۔سماع اور عرس میں خصوصیت سے دونوں جگہ بزرگ یکجا ہوتے۔لیکن خواجہ رکن الدین کے خلیفہ و جانشین شیخ عماد کے دو بیٹے علانیہ شیخ نظام الدین اولیا کی مذمت کرتے تھے۔البتہ اسی سلسلہ کے بزرگ شیخ نجیب الدین فردوسی نے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی مگر ان کے شاگرد مولانا فرید الدین، جنھوں نے ۷۶۔۱۳۷۵ء میں سنی فقہ پر ایک کتاب فتویٰ تاتار خانیہ لکھی، استاد کو مشہور کرگئے، دوسرے ممتاز صوفی بزرگ شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری ہیں، جو استاد کو چار چاند لگا گئے۔ان کا نام احمد، والد کا نام یحییٰ اور شرف الدین لقب تھا۔منیر (بہار) کو مستقر قرار دیا۔

شیخ شرف الدین (م: ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء) نے سونار گاؤں (بنگلہ دیش) میں قیام کرکے تقریباً بائیس برسوں (۵۱۔۱۲۲۹ء) تک مولانا شرف الدین ابوتو آمہ سے تعلیم و تربیت حاصل کرکے منیر واپس آئے تو ان کے والد ماجد شیخ یحییٰ کا انتقال ہو چکا تھا چند دنوں کے قیام کے بعد شیخ نظام الدین اولیا سے ملاقات کرنے کے لیے دہلی چلے گئے، وہاں سے پانی پت گئے شیخ بوعلی قلندر سے ملاقات کی۔پھر شیخ نجیب الدین فردوسی

سے ملاقات کر کے سلسلۂ فردوسیہ میں داخل ہو گئے۔ انھیں کی ہدایت پر دوبارہ منیر لوٹ آئے۔ پھر بارہ برسوں تک مگدھ (بہار) میں بہیا اور راج گیر کے جنگلوں میں عبادت و ریاضت کرتے رہے۔ عقیدت مندوں کی آمد سے خلل پڑنے لگا تو حاجتمندوں سے ملاقات کے لیے ہر جمع کو منیر آتے اور شمار جمعہ بھی پڑھانے لگے۔ شیخ نظام الدین اولیا کے ایک شاگرد مولانا نظام مدنی شیخ یحییٰ کے زبردست عقیدت مندوں میں تھے۔ انھوں نے منیر میں چھوٹی سی خانقاہ بنوادی۔ پھر سلطان محمد تغلق (م) کے حکم سے شاندار خانقاہ تعمیر ہوئی اور پرگنہ راج گیر جاگیر میں عطا ہوا۔ بعد میں شیخ شرف الدین نے نہ صرف یہ جاگیر کا فرمان سلطان فیروز شاہ تغلق کے حکم سے بہاری صوفیہ کے قتل پر احتجاج میں واپس کر دیا۔ ۱۳۸ بلکہ عوام کو اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس پر سلطان فیروز شاہ تغلق بہت خفا ہوا اور فرمان جاری کر کے محضر منعقد کرنا چاہا لیکن شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے سمجھا بجھا کر خاموش کر دیا۔ ۱۳۹ شیخ شرف الدین اپنے رویہ میں سہروردیوں سے زیادہ چشتیوں کے قریب تھے انہیں کی طرح حکام سے کنارہ کش اور مال و دولت سے بے نیاز اور عوام میں گھل مل کر انہیں راہ حق کی ہدایت کرتے تھے۔ انھوں نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، جن میں راحت القلوب، بحر المعانی، خوان پر نعمت، گنج لایعنی مسخ المعانی، مراۃ المحققین، مکتوبات، ملفوظات وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

شیخ شرف الدین کے خلفاء کی خانقاہیں پورے بہار پر محیط ہیں بلکہ بنگال، مشرقی اتر پردیش اور مدھ پردیش میں بھی ہیں۔ ان میں محض چند کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پھلواری (پٹنہ) میں سید منہاج الدین راستی، اور شیخ مظفر، ملک زادہ فضل الدین، مولانا نظام الدین جنھوں نے ناموری حاصل کی۔ بہار کے صوفیہ کا ذکر خواجہ شہاب الدین حق گو شہید زاہدی کے بغیر مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ جو ہندوستان میں سلسلہ زاہدیہ کے بانی ہیں۔ اس سلسلہ کے موسس خواجہ فخر الدین خدا داد بزرگ زاہد تھے، جو خواجہ شہاب الدین ۱، کعبہ کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔ بعض اس سلسلہ کو شیخ ابو اسحٰق شہریار گازرونی کی نسبت سے سلسلہ گازرونیہ بھی کہتے ہیں۔ خواجہ حق گو نے سلطان محمد تغلق کے فلسفۃ الملک عادل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، جس پر خفا ہو کر سلطان نے قلعہ کی چھت سے نیچے گرا دیا تھا کہ وہیں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کی قبر قلعہ کے دامن میں ہے ۱۴۰ سلسلہ زاہدیہ کے صوفیہ کی خانقاہیں، بنگال، بہار اور یوپی میں پھیلی ہوئی ہیں۔

سلسلہ نقش بندیہ کو ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ (م: ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء) نے جاری کیا جو موسس سلسلہ خواجہ بہاء الدین نقش بند کی دسویں پشت میں تھے۔ حالانکہ خواجہ باقی باللہ کے قیام ہند مدت محض تین سال تھی کہ ان کی وفات ہو گئی لیکن ان کے شاگرد اور خلیفہ شیخ احمد سرہندی معروف بہ مجدد الف ثانی (م: ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴ء) سے خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ شیخ احمد سرہندی کو صوفی کی بجائے پرجوش مبلغ کہنا زیادہ درست ہے۔ عام طور پر صوفیہ کا پیغام محبت مسلم و ہندو میں امتیاز نہیں کرتا لیکن شیخ احمد سرہندی نے نفرت کو محبت پر ترجیح دی۔ جہاں گیری دربار کے ایک اہم امیر اور اپنے ہیر بھائی شیخ فرید بخاری کو خط میں انھوں نے ہدایت کی کہ اہل تشیع سے سب کو دور رہنا چاہئے کیونکہ وہ ہندوؤں سے بھی بدتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شدت تعصب میں تصوف کا گذر نہیں ہو سکتا، انجام ظاہر ہے، نقش بندی خانقاہیں ویران و برباد ہو گئیں اگر ان میں چند باقی ہیں تو محض اس لیے کہ ان کا سلسلہ دوسرے سلسلوں سے وابستہ ہو گیا ہے۔ خاص کر ابو العلائیہ سلسلہ کو مقبولیت

حاصل ہے۔

ہندوستان میں سلسلہ قادریہ دیگر سلاسل سے منسلک ہوکر عام ہوا۔ موسس سلسلہ غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی . . کی وفات کے تین سو سال بعد اسی خاندان کی دسویں پشت شیخ محمد نے رائج کیا۔ اسی سلسلہ کے شاہ قمیص سے سلسلۂ قمیصیہ جاری ہوا۔ ایک اور بزرگ میر محمد عرف میاں میر تھے جو شہزادہ داراشکوہ کے مرشدوں میں تھے۔ لیکن اصلاً سلسلہ قادریہ کو شیخ ولی اللہ محدث دہلوی (م: ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کی بدولت مقبولیت حاصل ہوئی، جو اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے۔ ان کی فعال شخصیت مسائل و مباحث کو عصری تناظر میں دیکھا متعدد زایوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں اہم نشانِ منزل ہیں۔ وہ عہد وسطیٰ اور عہد جدید کے اسلام کے درمیان ایک پل کی طرح ہیں ... وہ ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ بیک وقت مفسر و محدث، فقیہ و نحوی عالم و دانش ور، ماہر سیاسیات اور باعمل صوفی صافی تھے۔ ان کے بعض عقائد و تصورات شدید اختلافی و انزاعی ہیں لیکن ان کی فعال شخصیت کی کرشمہ سازیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کو صوفیہ میں اس بنا پر خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے شریعت و طریقت کی مطابقت قائم کی۔ شریعت کی پابندی کے بغیر طریقت کو لایعنی قرار دیا۔ ان کے خانوادہ میں ان کے خلیفہ جانشین شاہ عبدالعزیز (م: ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) نے شیعیت کی رد میں تحفۂ اثنا عشریہ لکھی اور تصوف سے شیعیت کو جدا کرنے کی مہم میں اپنی عمر صرف کردی۔

صوفیہ میں سلسلۂ قلندریہ کی اپنی انفرادی شناخت ہے جو اپنے چار ابرو کا صفایا کرتے ہیں کیونکہ ان کے موسس شیخ عبدالعزیز مکی کے بال کبر سنی سے جھڑ گئے تھے، لہٰذا پیر کے تتبع میں مریدین اپنے چہرے ان کے مماثل بناتے ہیں۔ اصطلاح 'قلندر' کی مختلف تعبیریں کی گئی ہیں مثلاً سریانی میں اللہ کے ناموں میں ہے، فارسی 'گل' سے ماخوذ ہے جس کے معنی پاک و صاف کے ہیں، 'کلاں تر' یعنی بزرگ ہے صوفی درجۂ کمال تک پہنچ جائے تو قلندر ہے۔ خواجہ سید اشرف جہاں گیر کا قول ہے کہ قلندر وہ ہے جو دنیا سے اپنے رشتے منقطعہ کرچکا اور ظاہری و باطنی طور پر بالکلیہ بے تعلق ہوگیا ہو۔ قلندر صرف خدا کا طالب ہوتا ہے اور دنیا و عقبیٰ کی ساری دلچسپیوں کو خیرباد کردیتا ہے۔ وہ نہ اس دنیا میں صلہ کا آرزومند ہوتا ہے اور نہ ثواب آخرت کا متمنی۔ وہ صرف خدا کا طالب ہوتا ہے اور بس! سلسلۂ قلندریہ کے وجود میں آنے کے اسباب میں ان صوفیہ کے خلاف ردعمل بھی تھا جو فقیری کے نام پر اپنے حلقہ اثر بناتے، خانقاہوں میں وراثت قائم کرتے ترک دنیا کی تعلیم دینے کے عوض میں نام آوری حاصل کرتے تھے وغیرہ۔ شاہ خضر رومی شیخ عبدالعزیز مکی کے شاگرد تھے، جو صحابی رسول تھے۔ شیخ عبدالعزیز ہمہ اجازت رسول اکرم جنگلوں میں چلے گئے تاکہ وہاں تنہائی میں یادالٰہی میں مصروف رہ سکیں۔ وہ حضرت علی کے دور خلافت میں جنگل سے لوٹے اور بعد بیعت دوبارہ جنگل کو لوٹ گئے، پھر خواجہ بایزید بسطامی سے بیعت کرنے کے لیے ظاہر ہوئے، پھر شاہ خضر رومی کی ہدایت کے لیے آئے اور اجودھن سے غیبت میں چلے گئے، اب امام مہدی کے ساتھ دوبارہ آئیں گے۔ تاریخ صوفیہ میں قلندر پہلی بار دمشق میں توجہ کا مرکز بنے، جن کے رہنما مصر کے اندلس عرب یوسف اور ساوا کے شیخ جمال الدین کہے جاتے ہیں۔ شیخ جمال الدین ہندوستان بھی آتے تھے، جن کو شیخ نصیر الدین چراغ دہلی مفتی اور چلتی پھرتی لائبریری

کہتے تھے۔اس کے علاوہ قلندروں کے ایک حلقہ کے رہنما حسن الجوالقی تھے، جو ایرانی تھے لیکن انھوں نے مصر میں قلندروں کا مرکز قائم کیا تھا۔لیکن ہندوستان میں قلندروں کو شامل کر کے چشتیہ قلندریہ سلسلہ قائم کرنے کی روایت ۱۳ویں صدی سے شروع ہوتی ہے، جس کے بانی شاہ خضر رومی (م:۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) ہیں۔شیخ عبد العزیز کی کشفی شخصیت سے قطع نظر شاہ خضر رومی تاریخی شخصیت ہیں۔ بقول شیخ عبدالحق خضر رومی اپنے وطن مالوف اناتولیہ سے دہلی آئے اور شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید ہوئے۔شیخ نے ان کو اپنا لباس برقرار رکھنے کی اجازت دی۔ وہاں سے مشرقی یوپی میں سرہرپور (نزد جون پور) جا کر سید نجم الدین غوث الدھر کو اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کیا اور وطن مالوف اناتولیہ میں وفات پائی۔

قلندریہ روایات کے مطابق شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی (م:۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء) شاہ خضر رومی یا سید نجم الدین میں کسی ایک کے شاگرد تھے، جو اپنے علم و فضل اور روحانی کشف و کرامات کے لیے مشہور ہیں۔۱۴۵ حالانکہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی موت ایک قلندر کے بے رحم چھرے سے ہوئی تھی، لیکن قلندروں نے زیادہ تر سلسلہ چشتیہ ہی اختیار کیا۔ سہروردیوں میں بھی قلندر ہوئے۔ شیخ فخر الدین عراقی سہروردی قلندر تھے۔شیخ بہاء الدین زکریا قلندروں کو سخت ناپسند کرتے تھے کیونکہ جو بھی قلندر وارد ہندوستان ہوتا، پہلا نشانہ ان کی خانقاہ کو بناتا لیکن سہورن (سندھ) کے میر سید عثمان معروف بہ لال شہباز کو بیحد عزیز رکھتے تھے۔سید راجو قتال کے مریدین قلندر مرتضوی کہے جاتے ہیں، جو سہروردیہ ہوتے ہیں اور مشرقی اترپردیش میں ان کے مراکز ہیں۔اسی طرح سہروردیہ قلندروں کی ایک جماعت رسولی کہلاتی ہے، جس کے بانی سید شاہ عبد الرسول ہیں۔بعض قلندر اپنا سلسلہ شیعی صوفی شیخ نورالدین شاہ نعمت اللہ ولی (م:۸۳۴ھ/۱۴۳۱ء) سے قائم کرتے ہیں۔ان کا عقیدہ ہے کہ شاہ نعمت اللہ ولی سلطان محمد غوری (م:۱۲۰۵ء) کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے اور جنگ میں شہید ہوئے۔ان کی مزار کرمان میں نہیں ہانسی میں ہے۔ایک جماعت حیدری بھی ہے، جس کے بانی ترکی صوفی حیدر تھے۔اس طرح قلندروں کی مختلف جماعتیں ہیں، کن کن کا نام لیا جائے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جس خانقاہیت کے خلاف قلندر دمشق، ایران اور مصر سے آکر ہندوستان میں ہنگامہ کرتے رہتے، جب ہندوستان سے ابھرے تو خانقاہیت میں جذب ہو گئے۔تحریک تصوف میں رنگ و آہنگ قلندروں کی بدولت پیدا ہوا۔

ہندوستانی صوفیہ میں مجاہدوں کا ذکر ضروری ہے، جنھوں نے راہ خدا میں جہاد بالسان سے زیادہ جہاد بالسیف کو اہمیت دی، ان میں سپہ سالار مسعود غازی (م:۴۲۴ھ/۱۰۳۳ء) جو بالے میاں یا غازی میاں کہلاتے ہیں۔ مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں میں مقبول ہیں۔ان کا مزار مشرق اترپردیش کے بہرائچ میں ہے۔سلطان محمود غزنوی کے بھانجے اور سپہ سالار کہے جاتے ہیں جنھوں نے راجہ مہی پال کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا تھا لیکن سلطان محمود غزنوی سے اپنی قرابت کا لحاظ کر کے اپنے نام کا خطبہ نہ پڑھوایا لیکن ان کا نام تاریخوں میں نہیں ملتا، ممکن ہے کہ شہزادہ نصیر الدین محمود (۶۶-۱۲۴۶) کے ہمراہیوں میں رہے ہوں، جن کو بہرائچ میں قیام کے دوران مقامی ہندو راجاؤں سے جنگ کرنا پڑی تھی۔۱۴۷ بنگالی مجاہدوں میں سلہٹ کے شیخ جلال (م۔) ہیں، جو سلسلہ خواجگان کے صوفی تھے۔۱۴۸ راجہ گور گوبند سے جنگ ہوئی لیکن، شیخ جلال ہی فتح

جلال ہیں، جو سلسلہ خواجگان کے صوفی تھے۔ راجہ گور گوبند سے جنگ ہوئی لیکن، شیخ جلال ہی فتح یاب ہوئے۔ انھوں نے تمام مال و املاک اور زمین اپنے ساتھیوں میں تقسیم کردی۔ خود کچھ بھی نہیں لیا۔ شیخ جلال نے شادی نہیں کی تھی، اس لیے ان کا لقب ہی شیخ جلال مجرد ہو گیا۔

بنگلہ دیش کے چٹ گام سے ایک صوفی بزرگ کی مقبولیت داستان بن گئی ہے۔ ان کا نام شیخ بدر الدین یا پیر بدر عالم (م۔۲۲/دسمبر ۱۴۴۰ء) ہے، جن کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔ ان کے دادا خواجہ شہاب الدین حق نوتھے، جن کا ذکر گزشتہ سطروں میں آچکا ہے۔ شیخ بدر الدین کو روحانی تربیت ان کے والد اور شیخ جلال الدین بخاری سے حاصل ہوئی تھی۔ شیخ شرف الدین کی دعوت پر بہار گئے لیکن ان کے پہنچنے سے قبل ہی شیخ موصوف وفات پا چکے تھے۔ انھوں نے منیر پہنچ کر چالیس دنوں کا چلہ کیا، وہ جگہ ہنوز زیارت گاہ عام بنی ہوئی ہے۔ ان کے عقیدت مندوں میں ہندو اور بدھ شامل ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پیر بدر ایک چٹان کے ٹکڑے پر سوار ہو کر چٹگام آئے تھے، جو پانی میں تیر رہا تھا۔ اس سے پانی پر ان کا اختیار ثابت ہوتا ہے۔ مقامی ماہی گیر پانی کا سفر شروع کرنے سے قبل بڑے جوش میں گاتے ہیں:

अमरा अच्छी पोलापन	गाजी अच्छे निगहमन
श्री गंगादरिया पंचपीर	बदर बदर बदर बदर

(ہم بچے ہیں اور غازی ہمارے محافظ ہیں۔ گنگا ندی ہماری ہے۔ اے پنج پیر، اے بدر، اے بدر)

بنگالیوں کے عقیدہ پنج پیر ہیں غازی میاں (سالار مسعود) زندہ غازی (شیخ عبدالعزیز) خواجہ خضر اور پیر بدر! اسی طرح کی ایک شخصیت شاہ بدیع الدین قلب المدار بھی ہے۔ ان کا ذکر مطائف اشرفی میں موجود ہے۔ ان کی ذات سے کشف و کرامات کے کتنے قصے مشہور ہیں۔ شاہ مدار کا مزار مکن پور (اکبر پور، یوپی) میں ہے۔ ان سے صوفیہ کا ایک سلسلہ چلتا ہے، جن کو 'مداری' کہتے ہیں بے قائد و بے نوا۔ مداری درویش ڈم مدار، کا نعرہ لگاتے ہوئے آگ پر چلتے ہیں! ان کا ایک سلسلہ گورکھپور (یو۔پی) میں بھی ہے۔ وہاں مدریہ پہاڑی پر شاہ مدار کا میلہ لگتا ہے اور ایک طبقہ دھمال، ہے جہاں سے مداری ملنگوں کی ٹولی۔ دھمال، نکالتی ہے۔

صوفیہ ہند کا ذکر خواتین صوفیہ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا شیخ نظام الدین اولیا کہا کرتے تھے جب شیر جنگل سے برآمد ہوتا ہے تو کوئی اس کے جنس کے متعلق معلوم نہیں کرتا۔ اولاد آدم کو تقویٰ اور فرمان برداری کی راہ پر چلنا چاہئے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت! شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب میں خواتین صوفیہ پر ایک باب مخصوص کیا ہے، ان کے مطابق اولین خواتین میں سارہ بی بی کا نام لیا جا سکتا ہے، جو خواجہ بختیار کاکی کے ہم عصر ایک صوفی شیخ نظام الدین ابوالمعید کی والدہ تھیں۔ بابا فرید کی والدہ کا ذکر آچکا ہے، جن کی تربیت سے بابا فرید روحانی مراتب کو پہنچے۔ اسی طرح کی خاتون خواجہ نظام الدین اولیا کی والدہ بھی تھیں۔ بابا فرید بڑی عقیدت سے دہلی کی بی بی فاطمہ سام کا ذکر کرتے تھے، جو ان کو اپنا بھائی سمجھتی تھیں۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے بھی بی بی فاطمہ کا ذکر کیا ہے، جو تقدس، ترک دنیا اور عبادت میں نادر روزگار تھیں۔ کشمیر میں تصوف کا بیان لل عارفہ کے بغیر ممکن نہیں۔ کشمیر کی دیگر خواتین صوفیہ کا ذکر سلسلہ ریشیاں میں کیا جا چکا ہے۔

اس بیان کو ختم کرنے سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اہل تشیع میں تصوف کو دوبارہ قائم کرنے

ہو گئے۔ سلسلۂ نوربخش کے بانی علاء الدین محمد نوربخش (م ۱۴۶۴ء) شیعیت کے سخت خلاف تھے لیکن ان کے فرزند سید قاسم فیض بخش (م ۔۱۵۱۱) شیعہ ہو گئے۔ اس سلسلہ کے قاضی نوراللہ شوشتری کو ہندوستانی شیعہ 'شہید ثالث، کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

حواشی

۱ فصلنامہ راہ اسلام: شمارہ ۱۸۲، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۱ء
۲ محمد ہندوشاہ فرشتہ: گلشن ابراہیمی ج ا ص ۵۶۹
۳ سید علی ہجویری: کشف المحجوب (اردو ترجمہ محمد الطاف نیروی) ص ۲۰۸ (دہلی ۱۹۹۲ء)
۴ شاہ ملک: گلزار شمس معروف بہ کنز الانساب صص ۸۱۔۴۷۹
۵ سید فرمان علی: ترجمہ کلام الٰہی ص ص ۱۶۶۔ ۱۵۶۵
۶ ترجمہ کلام الٰہی ص ۹۵۸
۷ سید علی ہمدانی: مودۃ القربیٰ ص ۴۳ (اردو ترجمہ زاد العقبی سید شریف حسین سبزواری) مع عربی متن لاہور سے شایع ہوا۔ اس کی طبع دوم راقم السطور کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔
۸ محمد جمال قوام: قوام العقائد (اردو ترجمہ نثار احمد فاروقی) صص ۱۰۶۔۱۰۵ (دہلی ۱۹۹۴ء)
سید محمد حسینی: جوامع الکلم ج ۱ صص ۲۸۔۲۷ کان پور ۱۹۳۷ء)
۹ سعید نفیسی: سرچشمہ تصوف در ایران ص ۱۲۹ (کتاب فروشی مہر ماہ ۱۳۴۶ ھ ش)
۱۰ سخاوت مرزا: تذکرہ ص ۲۷ (حیدرآباد ۱۹۶۳ء)
۱۱ شاہنواز خان: ماثر الامرا (مرتبہ غلام علی آزاد بلگرامی) ج ۲ ص ۴۲۸
۱۲ مودۃ القربیٰ صص ۸۱۔۸۵
۱۳ کبیر احمد جائسی: ایرانی تصوف ص ۲۱۱ (علی گڑھ ۱۹۹۳ء)
۱۴ Birge, John Kingley : The Bektashi Order of Dervishes p236 (London 1937)
۱۵ Moojan Momem : An Introduction to Shi'i Islam p 210 (Delhi 1985)
۱۶ شیخ فرید الدین عطار: تذکرۃ الاولیاء (اردو ترجمہ طفیل احمد جالندھری) (دہلی ۱۹۹۹۶ء)
شیخ عبدالحق: اخبار الاخیار، اردو ترجمہ، محمد فاضل (دہلی سن ندارد)
محمد مجتبیٰ حسین: قرۃ العین، مخطوطہ مملوکہ وسیم حسن احمد، ایڈوکیٹ، ملاواں بزرگ، ضلع الہ آباد
سید خیرات حسن: تنویر الانساب، مخطوطہ مملوکہ راقم
موسیٰ منظور حسین: السلاسل والانسانید کتبہ محمد ایوب ابدالی مخطوطہ مملوکہ پروفیسر سید محمد طیب ابدالی، گیا
محمد غوثی (شیخ محمد شطاری): تذکرہ گلزار ابرار، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدرآباد
وجیہ الدین کاکوروی: بحر ذخار، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدرآباد
احمد الدعو یہ بھائی یعقوب: خزانۂ جلالی، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدرآباد
ضیاء العباسی: خزانہ جواہر جلالی، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدرآباد
دارا شکوہ: سفینۃ الاولیاء، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدرآباد
شاہ تقی الدین: منبع الانساب، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدرآباد
شاہ علی اکبر: مجمع الاولیاء، مخطوطہ، سالار جنگ لائبریری، حیدرآباد

شاہ علی اکبر: مجمع الاولیاء، مخطوطہ، سالار جنگ لائبریری، حیدرآباد
امام بیگ: ثمرات القدس من شجرات الانس، مخطوطہ، سالار جنگ لائبریری، حیدرآباد
سید صدیق حسن: الفرع النامی فی اصل السامی (بھوپال ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء)
غلام سرور لاہوری: تذکرہ خزینۃ الاصفیاء (لکھنؤ ۱۸۷۳ء)
سید امام الدین احمد: تاریخ الاولیاء (بمبئی ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء)
شیخ مبارک کرمانی: سیر الاولیاء (۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء)
جمالی: سیر العارفین (۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء)
سید غوث محی الدین رضوی: شرف الانساب (حیدرآباد ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء)
نسب نامہ سادات، مخطوطہ، سنٹرل لائبریری، حیدرآباد
ضیاء اللہ: نسب نامہ کلاں (لاہور ۱۳۰۹ھ/۱۸۶۱ء)
خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت (دہلی ۱۹۸۴ء)
موج کوثر: شیخ محمد اکرام (لاہور ۱۹۸۸ء)
محمد طیب ابدالی: الشرف (نالندہ ۱۹۸۰ء)
اختر مہدی: شاہ محمد اجمل اوآبادی وادب فارسی (دہلی ۱۹۹۲ء)
سید صباح الدین عبدالرحمن: بزم صوفیہ ص ۱۸۷ (اعظم گڑھ ۱۹۸۹ء)
۱۸ آیت اللہ شہید مطہری: اسلامی علوم کا تعارف (اردو ترجمہ: محمد عسکری) ص ۲۵۷ (دہلی ۱۴۱۷ھ)
۱۹ ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی: الکافی: کتاب المعیشہ
۲۰ راغب الطباخ:: تاریخ افکار وعلوم اسلامی (اردو ترجمہ افتخار احمد بلخی) ج ۲ ص ۱۵۲ (دہلی ۱۹۹۸ء)
۲۱ محمد قاسم غنی: تاریخ تصوف در اسلام ص ۱۹ (چاپ تہران)
۲۲ آیت اللہ مطہری: اسلامی علوم کا تعارف ص ۲۶۲
۲۳ تاریخ تصوف در اسلام ص ۵۵
۲۴ ابوعبدالرحمن سلمی: طبقات الصوفیہ ص ۲۰۶ (چاپ تہران)
۲۴ Saiyed Athar Abbas Rizvi : A Socio- Intellectual History of the Isna Ashari Shi'is in India vol. I p199 (New Delhi1986)
۲۵ اخبار الاخیار ص ۲۰۳
۲۶ امیر حسن سجزی: فوائد الفوائد ص ۳۹ (بلند شہر ۱۸۵۵ء)
۲۷ شیخ ابوالفضل علامی: آئین اکبری ج ۳ ص ۱۶۸ (لکھنؤ ۱۸۹۳ء)
۲۸ جمالی کنبوہ دہلی سیر العارفین ص ۷ (دہلی ۱۸۹۳ء)
۲۹ فوائد الفوائد ص ۲۹، سیر الاولیا ص ص ۸۔۱۷
۳۰ خلیق احمد نظامی: خیر المجالس ص ۸ (علی گڑھ ۱۹۵۹ء)
۳۱ احمد اللہ مصطفوی: نزہت القلوب ص ۱۵۲ (tr. G.Le Strange)
۳۲ Saiyid Athar Abbas Rizvi: A History of Sufism in India vol I p114.
۳۳ غلام علی آزاد: ماثر الکرام ص ۷
۳۴ آئین اکبری ج ۳ ۱۶۸۳۳
۳۵ جمالی کنبوہ دہلوی: سیر العارفین ص ص ۷۔۶

۳۷۔ اخبار الاخیار ص ۲۲۳ آئین اکبری ج ۳ ص ۱۶۸

۳۸۔ History of Sufism in India vol I p146

۳۹۔ سرور الصدور ص ۲۲۶

۴۰۔ حمید قلندر: خیر المجالس ص ص ۱۰۸۔۱۰۷

۴۱۔ امیر خورد: سیر الاولیا ص ص ۵۵۔۵۴

۴۲۔ ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۱

۴۳۔ ایضاً ایضاً ص ۳۳۳

۴۴۔ امیر خسرو: تغلق نامہ ص ۱۶ (حیدر آباد ۱۹۳۳ء)

۴۵۔ History of Sufism in India vol I p 251

۴۶۔ سید علی طباطبائی: برہان مآثر ص ص ۴۸۰۔۴۳، ۵۶ (دہلی ۱۹۳۶ء)

۴۷۔ منہاج سراج: طبقات ناصری ص ۱۵۲ (کلکتہ ۱۸۶۳ء)

۴۸۔ History of Sufism in India vol I p p 70-266

۴۹۔ فوائد الفواد صص ۲۳۶۔۲۷

۵۰۔ تاریخ فیروز شاہی صص ۴۰۔۴۱، (مترجمہ اطہر عباس رضوی، علی گڑھ ۱۹۵۶ء)

۵۱۔ M.A. Rahman: Social and Cultural History of Bengal I p99 (Karachi 1963)

۵۲۔ Rajatarangini of Kalhana(Tr. M. A. Sterin) .p 573 (Delhi 1991)

۵۳۔ فوائد الفواد ص ۲۱۶

۵۴۔ داؤد خاکی: دستور السالکین ص ص ۷۔۶۵ (سری نگر ۱۹۳۷ء)

۵۵۔ عبد الرحمن جامی: کتاب نفحات الانس ص ۴

۵۶۔ J. N. Ganhar & P.N. Ganhar: Buthusin in kslmir and hadakh p 15.

۵۷۔ حامدی کشمیری: شیخ العالم حیات اور شاعری ص ۹۳ (سری نگر ۱۹۹۸ء)

۵۸۔ محمد اسد اللہ وانی: شیخ العالم، ایک مطالعہ صص ۱۱۹۔۸۷

۵۹۔ حمید قلندر: خیر المجالس صص ۲۰۳۔۲۰۲

۶۰۔ شیخ شعیب: مناقب الآصفیہ صص ۴۰۔۳۳۹ (لکھنؤ ۱۸۷۰ء)

۶۱۔ مخدوم شاہ شعیب: مناقب الاصفیاء (مخطوطہ) مملوکہ پروفیسر طیب ابدالی (گیا)

۶۲۔ Aziz Ahmad :An Intellectual History of Islam in India p 36 (Edinburgh,1965)

۶۳۔ A.J.Arberry :An Introduction to the History of Sufism p 124 (Oxford,1942)

◆◆◆